اقبال ریویو

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کا رسالہ۔

اقبال اکیڈمی

"مدینہ منشن"، نارائن گوڑہ، حیدرآباد، آندھرا پردیش (انڈیا)

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا رسالہ

اشاعت اپریل ۱۹۹۵ء

مجلس ادارت

جناب مصلح الدین سعدی

جناب ذکریا شریف

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

جناب وجیہ الدین احمد

محمد ظہیر الدین احمد

(معتمد مجلس ادارت)

مجلس مشاورت

پروفیسر سعید اختر درانی

شعبہ طبعیات برمنگھم یونیورسٹی

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج

جناب محمد طارق غازی

مینجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ، جدہ

ڈاکٹر معین الدین عقیل

شعبہ اردو، جامعہ کراچی

پروفیسر سید سراج الدین

صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد

بدل اشتراک

ہندوستان

فی شمارہ ۔ ۳۰ روپے　　　دو شماروں کے لئے ۔ ۵۰ روپے

بیرونی ممالک

فی شمارہ ۔ ۴ ڈالر یا اس کے مساوی رقم

ISBN - 81 - 86370 - 02 -1

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
اقبال ریویو، دفتر اقبال اکیڈیمی، مدینہ منشن
نارائن گوڑہ حیدر آباد ۔ آندھرا پردیش (انڈیا)
پن کوڈ: 500029
فون نمبر: 595230

ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر وجیہہ الدین احمد معتمد اقبال اکیڈیمی نے اعجاز پریس چھتہ بازار حیدر آباد میں چھپوا کر دفتر اقبال اکیڈیمی نارائن گوڑہ ۔ حیدر آباد (آندھرا پردیش) سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

۱۔اداریہ	وجیہ الدین احمد	۲
۲۔بال جبریل کی غزلوں کا آہنگ و آب و رنگ	محمد بدیع الزماں	۵
۳۔اقبال اور سیتو مادھو راو پگڑی	معین الدین جینابڑے (مترجم)	۱۹
۴۔فکر اقبال میں ہندی عناصر	ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی	۳۰
۵۔اقبال سچدانند سہنا کی نظر میں	سید اختر علی تلہری	۵۱
۶۔شاعر مشرق علامہ اقبال	کرشن چندر	۶۲

اداریہ

اقبال ریویو کا زیر نظر شمارہ کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ خالص علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے اشاعت پذیر ہونے والے رسائل و جرائد کے ساتھ عموماً ایسا ہوتا ہے۔ ہم نے اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ اس جریدہ کو طبع زاد مضامین سے مزین کیا جائے (اور یہی باعث تاخیر بھی ہے) حصہ انگیزی میں پروفیسر احمد انصاری کا مضمون اقبال کی شاعری میں جرمن اثرات خاصہ کی چیز ہے ہندوستان کے ممتاز اسکالر سیتو مادھو راؤ پگڑی نے بانگ درا کی ۸۳ نظموں کا مرہٹی میں ترجمہ کیا تھا اور ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کیا۔ جناب معین الدین جینابڑے نے اس مقدمہ کو اردو منتقل کیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی ردلوی نے فکر اقبال میں ہندی عناصر کی نشاندھی کی ہے۔ یہ تینوں مضامین جناب محمد زکریا شریف صاحب (بمبئی) رکن مجلس ادارت اقبال ریویو کی شخصی دلچسپی کے باعث دستیاب ہوسکے۔ اس کے علاوہ اقبال ریویو میں قدیم جرائد سے اخذ کردہ اقبالیات پر مضامین شامل کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ مضامین اہل علم کی نظر سے پوشیدہ رہے ہیں۔ اس لئے اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ایسے اہم مضامین کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ زیر نظر شمارہ میں محمد بدیع الزماں، کرشن چندر اور اختر علی تلہری کے مضامین ان کی اہمیت کے پیش نظر ادبی دنیا کے قدیم شماروں سے لئے گئے ہیں۔

محمد بدیع الزماں

"بال جبریل" کی غزلوں کا آہنگ و آب و رنگ

شاعری میں آب و رنگ سے کسی شعر کے الفاظ "عبارات" اس کے استعارات و تشبیہات اور اس کا وہ مخصوص انداز بیان مراد لیا جاتا ہے جو کسی شعر کو شعر کا درجہ دیتا ہے۔ اس کو جب موزوں ترین الفاظ کے ذریعہ شعر کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے تو شعر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے اس میں پاکیزہ خیالات کو زود اثر بنانے کے لیے زبان کی آرائش و مشاطگی کرنی پڑتی ہے۔ مگر جاؤداں شاعری کے لیے محض زبان و بیان کی چاشنی یا طرز اظہار ہی کافی نہیں۔ معانی اور مواد کی اہمیت پھر بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ شعر و ادب کی اصل روح اس کا خیال ہے۔ اندرونی وحدت، ہم آہنگی اور تناسب کے بغیر الفاظ بذات خود کچھ نہیں۔ اس لیے آب و رنگ کی قدر و قیمت مواد اور موضوع پر منحصر ہے۔ محض نغمہ و سرود کی لطافت میں کھو کر رہ جانا شعر کو پر تاثیر نہیں بنا سکتا۔

اس طرح آہنگ سے مراد صرف صوتی گردہوں کا تسلسل نہیں بلکہ اس کو باہمی مربوط کرنے والے کسی نفسیاتی اصول کے مطابق تخلیق کو کہہ سکتے ہیں۔ کسی شاعر کی تخلیق کے آب و رنگ اور آہنگ کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ شاعر نے مجرد احساسات کو انداز بیان کا لباس فاخرہ پہنا کر کہاں تک کمال شدت سے دوسروں کے سوزدروں تک اسے پہنچایا ہے اور اس سے دوسروں کے لیے خوشدلی اور انبساط کے مواقع کہاں تک فراہم کیے گیے ہیں۔ لہذا آب و رنگ اور آہنگ منحصر ہے مواد اور ہیت معانی اور صورت کے ساحرانہ امتزاج پر، جو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے ہیں اور شاعری کے جمالیاتی پہلو کا راز اسی حسین امتزاج پر منحصر ہے۔ معنی سے قطع نظر حسن ادا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس کی روح رواں تخیل ہے جو آب و رنگ اور آہنگ میں مل کر قوس قزح کی دلکشی اور لطافت پیدا کرتی ہے۔ ایک عظیم شاعر کے خیالات اگر اعلیٰ و ارفع ہیں تو اس کے خیالات ہی حسن ادا میں رنگ بھر لیتے ہیں، جس کو اقبال نے اس طرح واضح کیا ہے •••

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

صنف غزل کے مخالفین کا کہنا ہے کہ غزل کا آرٹ تسلسل اور مربوط اور منظم فکر کے لیے

موزوں نہیں اور یہ کسی واضح اور روشن نظریے کی متحمل نہیں ہو سکتی - یہ بھی کہا گیا ہے کہ غزل کا دامان نگہ تنگ اور اس کے گل حسن، محدود ہیں - جہاں تک دامان نگہ تنگ ہونے کی بات ہے غالب نے، جنہیں اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعت چاہیئے تھی، بہت حد تک اس میں وسعت بخشی اور بڑے بڑے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے قابل اسے بنایا مگر پوری طرح وہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن اس وسعت کار چاہوا اظہار صرف اقبال کے یہاں ملتا ہے جس کی نمائندہ " بال جبریل کی غزلیں ہیں جو ایسے تو سمندر کی سطح دیکھنے سے معمولی اور بے شعور نظر آتی ہیں مگر اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن رہتی ہیں - زندگی میں رونما ہونے والے سارے خارجی تغیرات ان کی ان غزلوں میں پورے آب و تاب کے ساتھ رونما ملتے ہیں - ان میں ہمیں اس عہد کی ساری سیاسی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں کا پرتو صاف نظر آتا ہے - ان غزلوں میں انسانیت کا سوز و گداز، اس کی درد مندی، زندگی اور اس کے مسائل کی مفکرانہ اور نفسیاتی تحلیل کا رجحان ملتا ہے - ان کے خیالات میں رنگا رنگی اور موضوعات میں تنوع ہے اور اسی رنگا رنگی اور تنوع، وسعت اور ہمہ گیری کی بناء پر " بال جبرئل " کی غزلیں اردو شاعری میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں - اس میں فکر کی گہرائی، ماحول کی اثر اندازی، صوتی آہنگ، مشاہدہ کی ہمہ گیری اور شدت احساس ایک دوسرے پر سبقت لیتے نظر آتے ہیں -

اقبال نے ان غزلوں کی ہئیت کی تکنیک میں بہت سے نئے تجربے کیے اور انہیں بدلتے ہوئے ماحول اور حالات کے سانچے میں ڈھال کر ان میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی - انھوں نے ان غزلوں میں یہی نہیں کہ نئے الفاظ نئی تراکیب، نئی ملمیحات اور تشبیہات سے صرف زبان کا ذخیرہ وسیع کیا، ان میں معنویت اور تاثیر پیدا کی بلکہ ان کو بزم خاص سے اٹھا کر اصلاحات قوم و ملت کی تعمیری تحریکوں میں کار آمد موقعوں پر استعمال کیا - ہمیں " بال جبریل " کی ان غزلوں کی ہئیت کے تجربوں میں ایک نئی لے سنائی دیتی ہے، نئے لہجہ کا احساس ہوتا ہے، نئی اشاریت ملتی ہے اقبال کی بیباکی، جرائت آموزی، خلوص و صداقت جذبات نے غزل کی ہیئت میں ایک کھلی فضا قائم کی اور متناسب الفاظ کے انتخاب، اس کی نغمگی اور غنائی کیفیت، بحر کا ترنم اور اس پر مستزاد تخیل کی گہرائی نے انداز بیان کا نیا شعور عطا کیا جو دوسروں کے لیے مشعل راہ بنا -

" بال جبریل " کی غزلوں کا لب و لہجہ اقبال کی انفرادیت کے مزاج کو تعین کرنے میں بہت حد تک کار فرما ہے ان کی ان غزلوں کا اثر زیادہ تر لب و لہجہ کی بناء پر بھی ہے جو نہایت فنکارانہ ہے - مندرجہ ذیل غزل کا تصور، انداز بیان اور لب و لہجہ دیکھیے جس میں ایک قسم کی توانائی اور ایسا ولولہ ہے جو بیک وقت حیات پرور بھی ہے اور حیات آفرین بھی -

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں !

غلغلہ ہائے الاماں بتکدہ صفات میں !

یہ کہ شاعری جذبات کی تصویر کشی کا دوسرا نام ہے یہ غزل اس کلیہ پر پوری اترتی ہے اس غزل کے اشعار میں جو چیز تخیل اور تصور کو حرکت میں لاتی ہے وہ اس کے الفاظ اور ان کی بندشیں ہیں ۔ اسی قوت تحریک کو زور کہیئے یا حالی کے الفاظ میں جوش مگر یہ ان کے جذبات کی شدت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں اور جن جذبات کو وہ ابھارنا چاہتے ہیں وہ پورے طور پر ابھر کر سامنے آجاتے ہیں ۔ قافیوں کے التزام نے فکر کی یکسوئی کے لیے مرکزی نقطہ کا کام کیا ہے خیالات کے طوفان اقبال کے ذہن میں گرجتے اور گونجتے ہوئے اٹھتے ہیں اور یہی قافیے چٹان بن کر طوفان کے دھاروں کو صحیح سمت موڑ دیتے ہیں ۔ یہ قافیے معراج کے زینے ہیں جہاں تک مطلع کا سوال ہے اس غزل کا مطلع ذہن اور جذبات میں ایک تموج کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور غزل کے مجموعی اور بھرپور تاثر کا پس منظر پیش کرتا ہے ۔

اپنے جذبات کی شدت ، ذہنی ہیجان ، پر سوز کیفیت اور مزاج کی شورش کے اظہار کے لیے اقبال کے لب و لہجے اور تیور کی ایک اور مثال اس غزل میں ملاحظہ ہو:

یہ کون غزل خواں ہے پر سوز و نشاط انگیز
اندیشہ ، دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز !

صنف غزل کی مخالفت میں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ غزل گو شعراء کسی بات کو تسلسل اور ترتیب کے ساتھ نہیں کہہ سکتے اور جیسا کلیم الدین احمد صاحب نے کہا کہ غزل میں تسلسل تو جرم ہے ۔ غالب نے بھی چند مسلسل غزلیں کہیں مگر " بال جبریل " کی غزلیات جو گو نسبتاً بہت تھوڑی ہیں مگر وہ زیادہ تر مسلسل غزلیں ہی ہیں ۔ ان غزلوں میں اقبال کے جذبات اور خیالات مربوط ہو کر ایک دوسرے میں فطری طور پر پروتے چلے جاتے ہیں اور تسلسل کا باطنی رشتہ ان کے موڈ اور عام کیفیت پر طاری ہو کر شاعرانہ تخلیق کے عمل سے خود بہ خود ناطہ جوڑتا چلا جاتا ہے اور ایک شعر کے بعد دوسرے شعر میں اس کی لے تیز سے تیز ہوتی چلی جاتی ہے ۔ ان کی مسلسل غزلوں میں ایک مشہور غزل ہے:

اگر کج رو ہیں انجم ، آسماں تیرا ہے یا میرا ؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو ، جہاں تیرا ہے یا میرا ؟

اس غزل میں ایک ہی سرور ، جذبہ اور شدت احساس ساری غزل میں کار فرما ہے اور ان کی اس انفعالی وحدانیت نے غزل میں ایک خاص ترنم اور ایک مفکرانہ قطعیت پیدا کر دی ہے اس غزل کے لب و لہجہ میں اقبال کی شخصیت کی گونج زیادہ اثر انداز ہوتی ہے ۔ اشعار کے تیور اور کلام کی روانی و آہنگ سبھی عناصر ترکیبی اس میں موجود ہیں ۔ ان ہی صفات سے معمور ایک اور

مسلسل غزل ہے:

عالم آب و خاک و باد ! سر عیاں ہے تو کہ میں ؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں ، اس کا جہاں ہے تو کہ میں ؟

ان سارے معنوی محاسن کے علاوہ جو ان غزلوں میں نظر آتے ہیں صوری بیان میں بھی انداز بیان کے تکھے پن اور لب و لہجہ کے استفہامیہ انداز کے لحاظ سے یہ دونوں اپنی مثال آپ ہیں ۔ خدا سے شوخی بہتوں نے کی مگر اقبال کی جراءت آموزی قابل دید ہے ۔ ان دونوں غزلوں کی ردیفیں ۔ "تیرا ہے یا میرا" اور "تو کہ میں ؟" غیر مانوس ضرور ہیں مگر قافیوں کی مدد سے اسے اتنے لطیف طرح سے سجایا گیا ہے کہ اگر ان غزلوں کو مخصوص لب و لہجہ سے پڑھا جائے تو پڑھنے والے پر بھی وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ ردیف کی تکرار نے دو آتشہ ، سہ آتشہ کا کام کیا ہے ۔ ان غزلوں میں قافیے اور ردیف کے امتزاج سے جو آب و رنگ اقبال نے بھرا ہے اس میں شوخی و طنز ، جراءت آموزی ، توانائی اور ولولہ ، سب کو یکجا کر کے سب کے محاسن کو قائم اور نمایاں رکھا ہے ۔ اپنے جذبات و حسیات کو مربوط کر کے ہر شعر کا دوسرے سے باطنی رشتہ اپنی جگہ پر موجود ہے اور پوری غزلوں میں ایک موڈ اور کیفیت کی ہم آہنگی قائم رہتی ہے ۔

" بال جبریل " میں کچھ اور بھی ایسی مسلسل غزلیں ہیں جن میں موڈ کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی ہم آہنگی اور وحدت کا تسلسل اشعار کے انتشار کے باوجود قائم رہتا ہے اور معنوی تسلسل کا فقدان نہیں ملتا اور موضوع اور جمالیاتی پہلو پوری طرح ہم آہنگ رہتے ہیں ۔ جیسے یہ غزل:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر ، قلب و نظر شکار کر

فقر جیسے پیچیدہ اور خشک نکتہ کو ایک مسلسل غزل میں سمو کر اقبال نے تقدس اور پاکیزگی ، تفکر اور فلسفہ ، سب کو یکجا کر دیا ہے ۔ اور اس آمیزش نے اقبال کے فلسفہ کو شعر اور شعر کو فلسفہ بنا کر ایک کلی تصویر حیات کا نقشہ پیش کیا ہے ۔ غزل یہ ہے:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر ، فقر ہے شاہوں کا شاہ

ایک دوسری مشہور مسلسل غزل ہے:

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

اس غزل میں اذہان مادیت سے گذر کر و نور ربانی اور جلوہ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں ۔

"بال جبرئیل" کی غزلوں میں جب باتیں آہنگ اور آب و رنگ کی آتی ہیں تو ان غزلوں میں دوسری ساری خصوصیات کے ساتھ الفاظ کا قرینگی کے ساتھ دروبست اور ان کی تراکیب نغموں کے اعتبار سے ایسی شگفتگی پیدا کرتی ہیں جو قاری کے ذہن کی طرف خود بخود رہبری کرنے لگتی ہیں۔ آہنگ اور آب و رنگ کا حسین امتزاج مندرجہ ذیل غزل میں دیکھئے جہاں بہت سیدھے سادھے اور جانے پہچانے الفاظ کو تراکیب کی دلاویزی، برجستگی، سلاست و روانی اور پھر ردیف کی سبک روی اور موزوں بحر کے انتخاب سے اقبال نے جو صوتی ہم آہنگی پیدا کی ہے، وہ اتنی لطیف ہے کہ ہر صاحب ذوق کو گانے یا گنگنانے پر مجبور کرتی ہے:

پریشان ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے!
جو مشکل اب ہے یارب، پھر وہی مشکل نہ بن جائے!

ایسی ہی ایک دوسری غزل ہے:

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن
مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

اس دوسری غزل میں فطرت اور اس کے مظاہر سے بے شمار خوبصورت تشبیہات اور استعارات مستعار لے کر اور ان کے ذریعے متحرک تصاویر بناکر اقبال نے حسن سے والہانہ عقیدت اور حسن و عشق کی معصوم جستجو کا اظہار کیا ہے اور تخیلات و کیفیات کو اسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اظہار بیان کی نئی آراستگی اور بحر و ترنم کی ایک نئی ترتیب ملتی ہے۔ اس کی صوتی تنظیم سے ایک مخصوص آہنگ اور خاص سماعی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اس غزل کے مزاج کی مخصوص کیفیت سے مناسبت رکھتی ہے۔ یہاں بھی الفاظ، تشبیہات اور مناسب بحر نے شعر کی دلاویزی اور دلفریبی میں اضافہ کیا ہے۔

یوں بھی عام طور سے سوا اقبال کے کسی بھی اردو شاعر نے قافیہ پر تان نہیں توڑی ہے اور نہ آج توڑ رہے ہیں کیونکہ یہ سب کے بس کی بات نہیں مگر اقبال اکثر ردیف اڑا جاتے ہیں اور ایک ہی لفظ سے قافیہ اور ردیف دونوں کا کام لے کر حسن پیدا کرتے ہیں جیسے مندرجہ بالا غزل میں کہا جاتا ہے کہ ردیف کی سبک روی شعر کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد کرتی ہے اور یہ بھی کہ اس کا صوتی آہنگ شیرینی اور لطافت پیدا کرتا ہے مگر اسی غزل "پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن" کو دیکھئے اقبال نے بغیر ردیف کے بہت چھوٹے چھوٹے آسان اور عام فہم الفاظ کو بطور قافیہ استعمال کر کے کتنا خوش الحان صوتی آہنگ پیدا کیا ہے جو ہمارے ذوق جمال کو تسکین و مسرت سے ہم آغوش کرتا ہے۔ ردیف کی مجبوری سے ان کی کسی بھی غزل کے کسی بھی شعر کا مضمون دب نہیں گیا ہے اور نہ ان میں کرختگی اور بدنمائی آئی ہے۔ بحروں کے انتخاب نے

دوسروں کو بھلے رسوا کیا ہو مگر اقبال کی ہر غزل خواہ وہ کسی بھی بحر میں ہو، ترنم اور موسیقیت سے عاری نہیں اور نہ ان کے مخصوص فلسفے کے اظہار میں حارج ہر بحر ان کی قد آور شخصیت کی انمٹ چھاپ چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔

اقبال نے جہاں غزل گوئی کی تنگ دامنی کے باوجود اپنے پیچیدہ فلسفیانہ نکتوں کے اظہار کے لیے وسعت تلاش کرنے کا اجتہادی کارنامہ انجام دیا وہاں قدیم کردار اور موضوعات سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی جیسے ساقی کا کردار یا تصوف کا موضوع جن پر پوری اردو شاعری کا وجود عمل میں آیا۔ ایک ساقی کو لیجیے، اسے ہر شاعر نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق استعمال کیا۔ کہیں یہ مے فروش ہے اور کہیں یہ پیر مغاں بنا بیٹھا ہے۔ کوئی ساغر پٹک پٹک کر چشمہ زمزم نکال رہا ہے تو کوئی ساقی پر دین و ایمان تک لٹا دینے کو تیار ہے یہ سب اس لیے کہ اردو غزل اختصار کی بناء پر بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر، والی بات تھی مگر شباب و شعر کی اس محفل میں ایک مرد قلندر نے اس کردار کو الگ فرائض سونپے، اس سے مخاطبت کا نیا طریقہ وضع کیا مگر قبل اس دشت کی سیاحی کے اقبال نے دو ٹوک کہا•••

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ بازی کا

اس لیے کہ ان کا کہنا تھا کہ

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور

ساقی سے اقبال کی کیا مانگ ہے، انھوں نے اسے اپنی مثنوی "ساقی نامہ" میں بہتر طور پر واضح کیا ہے مگر "بال جبرئیل" کی غزلوں میں پورا "ساقی نامہ" کوزہ میں بند ہے۔ پہلی غزل ہے

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی!
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی!

اس غزل میں افکار، خیالات اور جذبات کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مریض طبیب سے وہ ساری کیفیات بیان کر رہا ہے جن کی بنا پر اس کے قوا مضمحل ہو گئے ہیں وہ طبیب سے "آب نشاط انگیز" پانے کا ملتجی ہے "آب نشاط" کا استعارہ گو روایتی ہے مگر اس غزل کے آہنگ اور آب و رنگ میں یہ ایک نئے انداز فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس غزل میں شاید ان کے دل کی بات پوری نہ ہو سکی تو دوسری غزل میں وہ اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس "آب نشاط انگیز" سے وہ اپنے کس کس قوا کو توانائی بخشنے کا کام لیں گے۔ وہ غزل یہ ہے

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!

ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی !

اس غزل کے متذکرہ بالا مطلع کا دوسرا مصرع اور اس میں خاص کر الفاظ "میرا مقام" ان کی پوری نفیس شاعری کا نچوڑ ہے۔ اسی مقام کو حاصل کرنے کے لیے اقبال نے چالیس برسوں سے زاہد شعر و سخن کی محفل گرم رکھی۔ اس غزل میں انھوں نے اس کی بھی وضاحت کی کہ اس "مقام کو حاصل کرنے کے لیے شعر و سخن کہاں تک ممد و معاون ہو سکتے ہیں مگر انھوں نے ایک کڑی شرط لگادی اور وہ یہ کہ اگر سینہ روشن ہے تب ہی سوز سخن عین حیات ہے ورنہ یہ مرگ دوام کے مترادف ہے۔ سینہ روشن نہ رہنے پر یہ "آب نشاط انگیز" سم قاتل بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی "مقام" کے حاصل کرنے کی طرف انھوں نے دوسری جگہ اس طرح اشارہ کیا ہے

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوے ہوؤں کی جستجو !

ان دونوں غزلوں میں اقبال نے انسانی شخصیت کی بالیدگی اور اس کی عظمت اور احترام کو بلند کر کے بشارت کی آواز بلند کی اور ایک نئے شعور، ولولے اور حوصلہ افزا روشن مستقبل کے تصور کو پیش کیا۔ ان دونوں غزلوں میں جذبات کا ایک تسلسل ہے اور ہر شعر ایک دوسرے مربوط سے علاوہ ازیں موضوع، مواد اور ہیئت کی، ہم آہنگی اور مخاطبت کا والہانہ انداز اپنے معراج پر ہے۔

روایت سے رشتہ رکھتے ہوئے ساقی کو اردو شاعری میں نیا رنگ و روپ دینے۔ اس کے کردار کی نئی تدوین کرنے میں اقبال نے اپنی انفرادیت یہاں بھی قائم رکھی یہ سب کچھ کیونکر ممکن ہوا؟ اس لیے کہان کی خودی سوز دروں کی بھٹی سے تپ کر نکلی تھی مگر ساقی سے التجا میں بھی ان کی شان بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ اپنے خیالی پیالوں کو لیے ہوئے شراب کی بھیک نہیں مانگتے بلکہ خودداری کا تو یہ عالم ہے کہ "بال جبرئیل" ہی ایک غزل میں کہتے ہیں

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پر توڑتا ہے سبو !

اقبال کی یہ خودداری ان کی سرشت میں داخل تھی، اس لیے کہ اس شعر سے بہت پہلے وہ "بانگ درا" کی نظم "شمع اور شاعر" میں کہہ چکے تھے کہ

تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

یہ وضع داری شاید اقبال نے غالب سے لی ہو جن کے وہ بہت معتقد تھے کہ ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

ساقی کی طرح تصوف نے بھی اردو شاعری کو امتیازی سوز و گداز عطا کیا۔ اقبال اور

تصوف ایک لمبی بحث ہے مگر مختصر یہ کہ اقبال اس تصوف کو جو اردو شاعری کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی منفی تصور کرتے تھے جس میں نہ حرارت تھی اور نہ سوز و گداز، نہ تو ترغیب عمل کے رجحانات فروغ پاسکتے تھے اور نہ روح میں بالیدگی آسکتی تھی۔ اقبال کا تصوف عمل کی روح رواں ہے جس سے مذہب میں انہماک، خلوص اور پختگی آتی ہے۔ وہ ایسے مافوق البشر کے متمنی تھے۔ جس میں خودی پوری آب و تاب کے ساتھ تکمیل پاچکی ہو۔ وہ فرد کی تکمیل کو سارے خیر اور کائناتی نظام کو درستی کا حل قرار دیتے تھے جو جذبہ، وجدان، آرزو مندی اور عشق کے ذریعہ تکمیل پاچکا ہو۔ عشق کی فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل "جبریل" کی اس غزل میں دیکھئے

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھادے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا
میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس
شعلے سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بے قرار کا
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

وحدت و کثرت، جزو و کل، غیب و شہود، تجلی و مشاہدہ، علوے فطرت و عروج روح، غرض عرفان نفس کی کوئی ایسی منزل نہیں جو "بال جبریل" کی غزلوں کے حدود سے باہر ہو۔ چند اشعار پیش ہیں

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا!
نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دور پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ
میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی
تو ہے محیط بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
عشق کی اک جست نے طے کردیا قصہ تمام

اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں !

اقبال نے "بال جبریل" کی غزلوں میں سماجی اور سیاسی اثرات کی ترجمانی اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے فن کی لطافتوں میں طنز کی تیزی شامل کی جس نے بیداری و عمل کے لیے اذان سحر گاہی کا کام کیا۔ انھوں نے بالواسطہ اور بلاواسطہ طنز کا استعمال کیا ہے۔ ان میں لطافت و تلخی، خطیبانہ ہیجان و طغیانی، سیاسی کرب و بیچینی اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے مضر اثرات پر ضرب کاری ملتی ہے۔ ان میں ایک مستقل چبھن اور نشتریت ہوتی ہے۔ ان کے ترکش سے نکلے ہوئے یہ تیر خود ان کی اور سننے والے دونوں کی جذباتیت کو تقویت پہنچاتے ہیں زیادہ تر صوفی و ملا ان کے طنز کا نشانہ ہے اس لیے کہ یہ ملت بیضا کی رہنمائی کرنے سے معذور تھے۔ اقبال نے اپنے تیکھے طنز کے آب و رنگ سے متذکرہ بالا سبھی موضوعات پر اردو غزل میں فکر کا ایک نیا آہنگ پیدا کیا جو دوسروں کے لیے مشعل راہ بنا۔ "بال جبریل" کی غزلوں کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں

مجھ کو تو سکھادی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

حاضر ہیں کلیسا میں کباب ومئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

قلندر جزو دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

یہ حوریان فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب

میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

"بال جبریل" کی غزلوں میں سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسائل اور اجتماعی تفکر کے بیان کے لیے اقبال نے حکیمانہ آہنگ اختیار کیا ان غزلوں میں سیاسی انقلاب کا تصور اور جذبہ آزادی کی عکاسی بھی ہے اور ایک خوش کن مستقبل کا پیام بھی جن کی تقلید میں "ترقی پسند شعراء کی ایک لمبی قطار سامنے آگئی۔ چند ایسے اشعار پیش ہیں

یارب یہ جہاں گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردان صفا کیش و ہنر مند

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

وہ آنکھ کہ ہو سرمہ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے ! نمناک نہیں ہے
زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی !
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی جنگیزی
نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

غزل کی اجزائے ترکیبی میں ایک مقطع بھی ہے اردو شعراء نے ولی سے لے کر حسرت تک ایک بھی ایسی غزل نہیں کہی جس میں مقطع نہ ہو، اس لیے کہ اس میں ان کو اپنی انا کا اظہار کرنا رہتا تھا حالانکہ مقطع کو بھرتی کا شعر کہا گیا ہے۔ کہنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مقطع میں شاعر گویا دربار کی آخری صف میں سگ دربار کی طرح بیٹھا ہے۔ اردو شعراء کی ساری معرکہ آرائیاں اور چشمکوں کی تان مقطع ہی پر ٹوٹتی تھی۔ غالب کو اپنے انداز بیان پر فخر کرنا تھا تو اس کا اظہار مقطع میں کیا گیا۔ داغ کو اگر یہ کہنا تھا کہ ہندوستان میں دھوم ان کی زباں کی ہے تو یہ بھی مقطع کا شعر ہو گیا برعکس اس کے چونکہ اقبال کا خمیر، بہ حیثیت شاعر، بالکل دوسری مٹی سے بنا تھا اس لیے "بال جبریل" کی قریب ۷۵ غزلوں میں مشکل سے چار پانچ غزلوں میں ہی مقطع ہیں مگر پھر بھی وہ ان مقطعوں میں اپنی انا کو تسکین نہیں دیتے بلکہ انتہائی عجز اور انکساری سے اپنی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں اور وہ انہیں اپنے جذبات اور ذہنی کیفیات کے مجموعی اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ وہ مشاطگی کے قائل تو تھے نہیں وہ تو اس کے قائل تھے کہ شعر کی بنیاد اگر اصلیت پر ہے تو وہ چاہے مطلع ہو یا مقطع، اس میں زور و اثر کا پایا جانا ضروری ہے۔ جیسے ان کے یہ مقطعے

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں
راز عرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ !
اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا

ان کی عجز و انکساری اور جذبات کی صداقت کا تو یہ عالم تھا کہ وہ تو سرے سے اپنے کو شاعر کہلوانے ہی کو تیار نہ تھے "بال جبریل" ہی کی غزلوں کا ایک شعر ہے

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اور پھر اپنی غزلوں کے متعلق فرماتے ہیں

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے آشنا میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہویا کہ تازی !

الغرض " بال جبریل " کی غزلیں آہنگ اور آب و رنگ کے لحاظ سے دوسرے شعراء کی ادبی تخلیقات سے بالکل الگ ہیں ۔ یہ بلند پیغامات کا مجموعہ ہیں اور ہر پیغام اپنی جگہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے ۔ بیشتر غزلوں کے اشتعال انگیز تیور ہمارے تخیل میں سنگ و آہن کی سختی پیدا کرتے ہیں ان کے موضوعات نفس انسانی سے متعلق ہیں اور انداز بیان شگفتہ ، دلربا اور دلبر ہے ۔ مخصوص علامات الفاظ اور تشبیہات نے ہر موضوع کو بلیغ معنوں کا حامل بنادیا ہے ۔ ان غزلوں کے ذریعہ اقبال نے فرشتوں کو آدم کی تڑپ اور آدم کو آدب خداوندی سکھانے کا کام لیا اور ان کی جذب و مستی نے تن آساں عرشیوں میں کھلبلی مچادی ۔ شکایت حضور حق تک پہنچی کہ

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا
اقبال بھلا نچلے کب بیٹھنے والے تھے ، جھٹ دو بدو کہہ بیٹھے
اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی !

غزل کی خوبیوں اور خامیوں پر حالی سے لے کر کلیم الدین احمد تک دفتر کے دفتر لکھے جاچکے ہیں ۔ نقادوں نے اردو شاعری کے لیے فن نقد کا جو بھی معیار اب تک متعین کیا ہے اس کسوٹی پر ولی سے لے کر حسرت تک سبھوں کو پرکھا گیا مگر تاج زریں کی مستحق اقبال کی شاعری مجموعی طور پر اور بال جبریل کی غزلیں خصوصی طور پر قرار پائیں ۔ کلیم الدین احمد سرے ہی سے بحیثیت صنف غزل ہی کے قائل نہیں تھے مگر ان کی کڑی کسوٹی پر بال جبریل کی غزلیں کہاں تک پوری اترتی ہیں ان ہی کی زبان سے سنیے تو لطف آئے گا

" اقبال نے غزل کی فضا بالکل بدل دی ۔ ایک نئی راہ نکالی جس پر دوسرے بھی چلنے لگے لیکن یہ بھی بھول گئے کہ یہ راہ اقبال نے کھولی ہے ۔ جیسے ترقی پسند شعراء یہ بھی غزل میں نئے مضامین باندھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں لیکن مضامین وہی ہیں جو ترقی پسند لکھنے والوں کی مشترکہ جاگیر ہیں ۔ ان کے

خیالات کی دنیا بھی محدود ہے۔ وہ اس مختصر دائرے میں خوش نظر آتے ہیں۔
ان میں یہ سکت نہیں کہ اقبال کی طرح ایک نئی دنیا بنائیں"۔ (از کتاب
"اردو شاعری پر ایک نظر حصہ دوم)

بال جبریل کی غزلوں کے آہنگ اور آب و رنگ کو خراج تحسین پیش کرنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ

علامہ اقبال نے تو اپنے فلسفے، عقیدے اور سماجی و سیاسی مضامین کو خوب اچھی طرح گھلا کر اپنی غزلوں میں ایسا سمیٹ دیا ہے کہ اگر اردو غزل میں اور کچھ نہ رہ جائے صرف اقبال کی چند غزلیں رہ جائیں تو ایک صدی تک اردو غزل کی بقا کا سامان یہی کافی ہے۔ انہی سے اور کئی نپلیں پھوٹیں گی اور ان کونپلوں سے اور غنچے نکلیں گے پھر یہ گلبن اپنی ارتقائی شکلوں کے ساتھ اور رنگا رنگ پھولوں کے ساتھ ہرا بھرا رہے گا" (از کتاب۔ "زبان و بیان")

یہ ہیں الفاظ ملک کے مشہور نقاد ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے، جن کی تجر علمی کا قائل نہ ہونا، اپنے ذوق سلیم کی توہین ہے۔

اردو شعرا کی آپس کی رقابتوں اور اپنے ہمعصروں سے عناد کو صاحب "آب حیات" نے تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ مگر اقبال کو ان کے دو ہمعصر شعراء نے کن نظروں سے دیکھا ان کا ذکر نہ کرنا شاید اس مقالے سے ناانصافی ہوگی۔ یہ ہیں جوش اور فراق ایک نے اقبال کے متعلق یہ رائے ظاہر کی

"اقبال قدرت کی طرف سے ایک سمندر بن کر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن یہ ایک ادبی المیہ ہے کہ وہ ایک تالاب ہو کر مرگئے۔ ان سے میں قطعی متاثر نہیں ہوں"

(از ماہنامہ۔ "جمالستان" دہلی جنوری ۱۹۶۴ء)

یہ تھے "جنگل کی شہزادی" کے مصنف جوش ملیح آبادی جن کی نظریں فرش ہی پر ٹکی رہ گئیں۔ دوسرے ہیں فراق گورکھپوری جو صحیح معنوں میں غزل گوئی میں اقبال کو اپنا حریف سمجھ سکتے تھے مگر ان کی وسیع النظری یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ

"سائنس، جدید سوشیالوجی، جدید فلسفہ، جدید فضا اور ماحول، مغرب اور مشرق کا تصادم اور ان کا امتزاج جس طرح غزل میں رونما ہوا اس کی نمایاں مثال اقبال کی غزلیں ہیں اور یہ اثر بال جبریل اور ضرب کلیم میں اتنا تیز اور نمایاں ہے کہ اقبال کی غزلیں اردو شاعری میں انقلاب کا حکم رکھتی ہیں"

(از ماہنامہ "نگار" لکھنؤ۔ جنوری، فروری ۱۹۵۰ء)

اب آخر میں بال جبریل کی غزلوں میں آہ سرد کی بجائے نفس گرم کی چنگاریاں بھی دیکھتے چلیے

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

جناب سیتو مادھو راؤ پگڑی

مختصر تعارف

جناب سیتو مادھو راؤ پگڑی لاتور (ضلع عثمان آباد کا ایک تعلقہ جو اب خود ایک ضلع بن چکا ہے) میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ گلبرگہ عثمان آباد اور پونے میں تعلیم حاصل کی حیدرآباد سول سروس کے لئے منتخب ہوئے اور حکومت حیدرآباد میں بحیثیت تحصیل دار اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ کئی اضلاع پر بحیثیت اول تعلقہ دار متعین رہے۔ محکمہ تعلیمات مالگزاری اور امور داخلہ کی معتمدی پر بھی فائز رہے۔ ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر حیدرآباد کی تقسیم عمل میں آئی تو وہ مہاراشٹرا کے لئے نامزد کئے گئے یہاں بھی وہ کئی اہم محکموں کے معتمد رہے۔ بحیثیت ڈائرکٹر مہاراشٹرا اردو گزٹیر بھی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے بہت سی قیمتی اور اہم مغل اور مرہٹہ دور کی تاریخی دستاویزات کا مرہٹی اور انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان کی تاریخ دانی اور ذوق ادب کا یہ عالم تھا کہ حیدرآباد میں بحیثیت اول تعلقدار جب وہ دوروں پر جاتے تو تاریخ اور ادب کے موضوعات پر ان کی تقریریں سننے کے لئے خصوصی جلسے منعقد کے جاتے۔ وہ تحقیق ترجمہ اور تخلیق تینوں میدانوں کے شہوار تھے ان کی انگریزی تالیف " دکن اٹھارویں صدی میں " تاریخ کی بہت اہم اور مستند کتاب ہے۔ حکومت ہند اور حکومت کرناٹک نے انہیں اعزازات عطا کئے۔ وہ اردو فارسی کنڑی تلگو مرہٹی اور انگریزی پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو ۹۴ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ انھوں نے بانگ درا کی ۸۳ نظموں کا مرہٹی میں ترجمہ کیا اور ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کی جانب سے شائع کیا۔ زیر نظر مضمون اسی مقدمہ کا اردو ترجمہ ہے۔

معین الدین جینابڑے
شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی

اقبال اور سیتو مادھو راو پگڑی

بانگ درا کے مرہٹی ترجمے کا مقدمہ

[تفہیم اقبال ایک دشوار گذار مرحلہ ہے۔اس سے کامیاب و کامران گذرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔اس کے تقاضے اتنے متنوع اور شدید ہیں کہ ہر شخص انہیں پورا نہیں کر سکتا۔اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر مکمل عبور، دونوں زبانوں کی شعری روایت سے بھرپور واقفیت، نیز تاریخ عالم اور اسلامی تاریخ کے گہرے مطالعے کے علاوہ فلسفیانہ مباحث سے طبعی مناسبت کی شرطوں کا بیک وقت پورا کرنا واقعی دشوار ہے۔

سیتو مادھو راو پگڑی ان شرائط کو بہ حسن و خوبی پورا کرتے تھے۔لہذا اس دشوار مرحلے کو سر کرنے کے بعد انہوں نے ایک اور دشوار تر منزل کی جانب پیش رفت کی۔انہوں نے اردو سے ناواقف مراٹھی داں عوام کو اقبال سے متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔اقبال کی ۸۳ نظموں کے منثور ترجمے اور بسیط مقدمے پر محیط ان کی مراٹھی کتاب بانگ درا ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آئی جسے مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔

ذیل میں اردو داں علم دوست حضرات کے استفادہ کے خیال سے اس کتاب کے مقدمے کا ترجمہ پیش ہے۔مترجم]

اردو کے معروف شاعر اقبال کے مجموعہ کلام بانگ درا کی ۸۳ نظموں کا مراٹھی ترجمہ پیش خدمت ہے۔مراٹھی قاری ان مترجمہ نغموں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگا سکے گا کہ عالمی شہرت کے حامل اس شاعر کے کلام کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں اور اردو ادب میں اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔

اٹھارویں صدی کے ساتھ ہی جدید اردو ادب کا آغاز ہوتا ہے۔اس سے قبل جنوبی ہند کے شاہی درباروں اور صوفیاء کی خانقاہوں میں اردو ادب کی ایک توانا روایت کا دور گذر چکا ہوتا ہے۔جنوبی ہند کی اس ادبی روایت کو "دکنی اردو کی ادبی روایت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔مقامی زباں اور لہجے، مخصوص اسالیب اور متعین موضوعات کی وجہ سے جنوب کی یہ ادبی روایت بعد میں منظر عام پر آنے والی شمال کی روایت کے مقابلے میں اپنی الگ اور آزاد شناخت رکھتی ہے۔اردو کے دکنی

دور کے عرصے میں شمالی ہند میں مستثنیات سے قطع نظر اردو بول چال کی حد تک محدود تھی۔ شاہی دربار میں فارسی کا چلن تھا اور شعراء حضرات بھی اس میں داد سخن دیا کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے آتے آتے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کے پیش نظر شمالی ہند میں بھی اردو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بننے لگی۔ ان دنوں ملک کے طول و عرض میں اردو کے اس شمالی روپ کا چلن عام ہے اس لئے دکنی اردو اس کے مقابلے میں پچھڑ سی گئی ہے۔

گزشتہ پونے تین سو برسوں میں اردو ادب نے ترقی کی کئی منزلیں سر کی ہیں۔ یہ ترقی کسی ایک صنف تک محدود نہیں بلکہ ہمہ جہت ترقی ہے۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر مختلف اصناف سے وابستہ چند اہم نام گنوائے جاتے ہیں۔ غالب، میر اور اقبال (شاعر) سر سید احمد (مصلح اور نثر نگار) حالی (شاعر اور سوانح نگار) شبلی نعمانی (مورخ) منشی پریم چندر اور قرۃ العین حیدر (ناول نگار)۔

اردو شاعری کا خیال آتے ہی ہمیں کئی مشہور شعراء کے نام یاد آنے لگتے ہیں۔ جیسے میر، سودا، غالب، مومن، ذوق، داغ، اقبال، میر حسن، انشا، مصحفی، نظیر اکبر آبادی، حسرت موہانی، برج نارائن چکبست، دیا شنکر نسیم، اختر شیرانی، جگر مراد آبادی جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور رگھو پتی سہائے فراق اس اجمالی فہرست میں شامل ہیں میر متوفی (۱۸۱۰ء) غالب (۱۸۶۹ء تا ۱۷۹۷ء) اور اقبال (۱۸۷۸ تا ۱۹۳۸) کے نام اس بناء پر خصوصیت رکھتے ہیں کہ گزشتہ ڈھائی سو برس کے عرصے سے ان کی آواز برابر گونج رہی ہے۔

اقبال کے پیش رو اہم شعراء یا تو دہلی کے رہنے والے تھے یا پھر لکھنو کے ان میں سے بیشتر کو کسی نہ کسی صورت میں بادشاہ وقت یا کسی نواب کی سرپرستی حاصل تھی وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ ان شاعروں نے فارسی کی شعری روایت سے بھرپور استفادہ کیا۔ انھوں نے فارسی کے مضامین کو ان کے تمام تر

علامتی نظام اور اسالیب بیان کے ساتھ اردو کے قالب میں بڑی کامیابی کے ساتھ ڈھالا۔ غالب کے لہجے میں انسان دوستی کے دوش بدوش، نجی محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود پائی جانے والی خود اعتمادی کی کھنک نے اسے ابدی مقبولیت عطا کی ہے۔ سرگوشی کے سے انداز میں دل کی باتیں سناکر انسان کے باطن میں طوفان اٹھانے کی صفت نے میر کو حیات جاوید بخشی ہے۔ بعد کے شعراء اور ان کے دیگر معاصرین کے بخت نے اس طرح یاوری نہیں کی۔

متعدد ادیبوں کے ساتھ تو یہ ہوا کہ مغربی علوم سے ناواقفیت، غیر ممالک کی سیر کے موقعوں کی عدم دستیابی اور مالی پریشانی جیسے عوامل کی وجہ س وہ دل گیر ہوگئے اور ان کا جوہر پوری تب و تاب کے ساتھ چمکنے نہیں پایا۔ اس ضمن میں مراٹھی کے چندر شکھیر، کیشو سنوت، کوی ونائیک، بال کوئی اور تامبے بے ساختہ یاد آتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے غالب کی انسان دوستی نے اسے امر بنادیا ہے غالب کے بعد کے شعرا کی نسل کے یہاں مغربی علوم سے بڑھتی ہوئی واقفیت اور سید احمد خان کی اصلاحی کاوشوں کے نتیجے میں روایتی موضوعات سے آگے بڑھ کر فطرت کی تصویر کشی اور سماجی مسائل کو شعر میں برتنے کا رجحان جڑ پکڑنے لگا۔ اس نئے رجحان کی بھرپور نمائندگی الطاف حسین حالی کرتے ہیں۔ اس امتیاز کی بنا پر حالی کو جدید اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا جاسکتا ہے۔ حالی (۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء) ایک لمبے عرصے تک غالب کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ اپنے معاصرین کی طرح وہ بھی قدیم شعری روایت اور تہذیبی ڈھانچے کے پروردہ تھے۔ لیکن سرسید کی تحریک نیز انگریز پروفیسروں اور عالموں کی ہمت افزائی کچھ ایسا رنگ لے آئی کہ انھوں نے روایتی شعری ڈگر سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کی۔

اردو ادب میں اقبال کی سی صلاحیتوں کے حامل فن کار کی آمد کے لئے یہ بڑا ہی مناسب و موزوں وقت تھا۔

اردو اقبال کی مادری زبان نہیں تھی۔وہ نسلاً کشمیری برہمن تھے۔دو ڈھائی سو برس قبل ان کے اجداد میں سے کسی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔قبول اسلام کے بعد یہ خاندان کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہو گیا۔سیالکوٹ پنجاب کا ایک شہر ہے۔اس شہر میں ۱۸۷۸ء (۱۸۷۷ء) میں اقبال کا جنم ہوا۔اقبال کے سن پیدائش کے تعلق سے محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔اقبال نے انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی اور اس کے بعد لاہور گئے۔وہاں انھوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ان دنوں گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے۔آرنلڈ کی وجہ سے فلسفے میں اقبال کو دلچسپی پیدا ہوئی اور بالاخر انھوں نے اسی مضمون میں ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔

ایم۔اے ہو جانے ک بعد وہ پہلے اورینٹل کالج میں اور پھر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔وہ انگریزی اور فلسفہ پڑھایا کرتے تھے۔

اقبال کی شعری تخلیقات ۱۸۹۷ء سے لوگوں کے سامنے آنے لگی تھیں فارسی پر انہیں حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ان کی اہم تصانیف فارسی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ان کا انگریزی کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ان کی ابتدائی نظموں پر شیلے، بائرن، ورڈس ورتھ، کیٹس وغیرہ کا اثر صاف نظر آتا ہے۔اقبال نے ٹے نی سن اور لونگ فیلو کی چند ایک نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔

اقبال کی شعر گوئی کا اولین دور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں تک پھیلا ہوا ہے وہ آزادی کی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔اقبال بھی اس قومی تحریک سے متاثر ہوئے۔ان دنوں کہی ہوئی ان کی نظم ...

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

آج بھی ہر شخص کی زبان پر ہے۔۔

انگلینڈ روانگی: فلسفے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلینڈ

گئے۔ وہاں انھوں نے کیمبرج یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے وہ جرمنی بھی گئے۔ ان دونوں ملکوں سے انھوں نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ اسی دوران وہ بیرسٹری کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب قرار پائے۔ فلسفے میں اقبال کا موضوع تصوف کا فلسفہ اور ایرانی مابعد طبیعات تھا۔ بعد ازاں انھوں نے فرانس، جرمنی، اسپین، اور اٹلی کا دورہ کیا۔ ان ملکوں کے فلسفیوں، سیاستدانوں اور ادیبوں سے مل کر تبادلہ خیالات کیا۔ فلسفہ کے مطالعے کی وجہ سے اقبال کی شاعری ایک نئی جہت سے آشنا ہوئی۔ انھوں نے اردو میں کم اور فارسی میں زیادہ کہا۔

اقبال نے سیاست میں بھی دلچسپی لی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بنے اور تین برسوں تک رکنیت کی ذمہ داری کو سنبھالتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں وہ ایک نمائندے کی حیثیت سے شریک تھے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں منعقدہ کل ہند انڈین مسلم لیگ کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ اقبال نے خطبہ صدارت میں ان علاقوں کے ایک علیحدہ فیڈریشن کا مطالبہ کیا جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ بہتوں کے نزدیک ملک کے بٹوارے کی ابتدا اقبال کے اس مطالبے سے ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں اس مطالبے نے بٹوارے کی مانگ کی شکل ہرگز اختیار نہیں کی۔ اقبال شائد صرف اتنا چاہتے تھے کہ ملک کی وحدت اور سالمیت کو زک پہنچائے بغیر مسلم اکثریت کے علاقوں کو ایک فیڈریشن کی حیثیت سے خود مختاری عطا کی جائے۔

اقبال کے یہاں انگلینڈ روانگی سے قبل اور واپسی کے بعد کی شاعری میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ روانگی سے قبل ان کے محبوب موضوعات حب الوطنی اور مناظر فطرت کا بیان تھے۔ واپسی کے بعد ان کی جگہ فلسفے نے لے لی۔ اب وہ اسلام کی سیاسی طاقت کے ٹوٹنے اور مسلم معاشرے کے زوال کے اسباب و علل پر غور کرنے لگے تھے۔ وہ تو کہیئے کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اس پائے کی تھیں کہ فلسفہ ان کے شعر پر غالب نہ آسکا۔ انھوں فلسفیانہ فکر و مضامین کو شعر کے پیکر میں ڈھالنے کا معجزہ انجام

دیا ہے۔

اقبال کا ادب: اقبال نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے۔ فارسی کے ذریعے وہ اپنا پیغام ہندوستان کے باہر بھی پہنچانا چاہتے تھے۔

۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیانی عرصے میں ان کی پہلی تین فارسی تخلیقات اسرار خودی، رموز بے خودی اور پیام مشرق منظر عام پر آئیں۔ اس سے قبل ۱۹۰۸ء میں یورپ سے لوٹ کر انھوں نے لاہور میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ فارسی کے جید عالم اور مشہور پروفیسر نکلسن نے ان کی طویل مثنوی اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے نے اقبال کو دنیا بھر میں مشہور کر دیا اور ان کی شاعری سنجیدہ مطالعے اور مباحثے کا موضوع بنی۔ اقبال کا اولین اردو مجموعہ کلام قدرے تاخیر سے یعنی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء تک دو اور اردو کتابیں بال جبرئیل اور ضرب کلیم شائع ہوئیں

اقبال نے مدراس یونی ورسٹی میں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے موضوع پر لیکچر بھی دیے۔ یہ خطبات اقبال کے ذہن اور فکر کو سمجھنے میں بڑے مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ فارسی میں مزید تین کتابیں جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور ارمغان حجاز شائع ہوئیں۔

تخیل کی پرواز: بانگ درا میں مناظر فطرت کا بیان شاعرانہ تخیل کے عمدہ نمونوں سے بھرا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر ہمالہ کی تعریف میں یہ شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

اے ہمالہ، کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی

کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بجتی گاہ ٹکراتی ہوئی

میری ترجمہ کردہ اس کتاب میں شامل، ابر کہسار، ایک آرزو، ماہ نو، چاند، جگنو، بزم انجم، شبنم اور ستارے وہ نظمیں ہیں جن کے تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظمیں نہیں۔ پھول ہیں جو اقبال نے شاعری کی دیوی کے چرنوں پر چڑھائے ہیں۔
جگنو کے بیان میں تخیل کی اڑان غور طلب ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسمان سے اڑکر کوئی ستارہ
یا جان پڑگئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

اقبال نے پربھو رام چندر، گرونانک، سوامی رام تیرتھ پر بھی نظمیں کہی ہیں ایک نظم نیا شوالہ میں وہ ہند کے برہمن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اب یہ مندر اور مورتیاں اتنے پرانے ہو چکے ہیں پرستش کے لائق نہ رہے۔ اب تو صرف مادر وطن کی مورتی پوجی جائے گی۔ تم سمجھتے ہو کہ پتھر کی مورتی میں خدا ہے میرے لیے خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا ہے۔

اقبال ملت اسلامیہ کا درد رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی پر وہ محض جذباتی نوحہ گر کی طرح ماتم گسار نہیں تھے۔ انہیں اس کا شدید احساس تھا کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ کئی مشرقی ممالک یوروپ کے استبداد کا شکار تھے۔ ان کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ عہد وسطیٰ کے عربوں اور ان کے بعد ترکوں کی فتوحات سے واقف تھے۔ انہیں اس حقیقت پر فخر تھا کہ مسلمان اسپین، سسلی جنوبی

فرانس اور بلقان پر حکومت کر چکے ہیں تاہم انہیں یہ غم بھی کھائے جا رہا تھا کہ وحدت کا پرستار مسلمان آج غلاموں کی زندگی جی رہا ہے اور ایک وقت وہ تھا جب اس نے نسل اور ذات کے بھید کو مٹا دیا تھا اور غیر صحتمند قدروں سے انسانی معاشرہ کو پاک کیا تھا اپنی مشہور نظم شکوہ میں اقبال اللہ سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری وحدت کا پیغام دنیا میں پھیلانے والے ہمیں تھے مئے توحید کے نشے سے سرشار دنیا جہاں کی خاک ہمیں نے چھانی، ہمارے سوا وہ کون تھا جس نے تیرے بندوں کو وحدت کی تعلیم دی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب یہ ملتا ہے کہ آج مسلمان فرقہ بندی کا شکار ہیں تم نے خود کو قوموں، ملکوں اور جماعتوں میں بانٹ رکھا ہے۔ تم اپنے ایرانی، ترک، عرب اور افغان ہونے پر فخر کرتے ہو۔ بھلا بتاؤ تو تم میں کوئی مسلمان بھی ہے؟ مسلمان تو ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

تصوف اور اقبال مسلمانوں کے زوال کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک اہم سبب اقبال کی نظر میں تصوف کی غیر صحت مند تاویلات رہی ہیں۔ ان تعلیمات کے زیر اثر انسان پہ ایک طرح کا جمود طاری رہا اور یہ سمجھا گیا کہ ایک قطرہ کے مانند اپنی شخصیت کو سمندر میں گم کر دینا ہی نجات ہے مسلمانوں حق میں یہ بات سم قاتل ثابت ہوئی ہے۔ اس کے برعکس انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو بیدار کرے اور اپنے عروج کی خاطر قدرت کے اسرار کو کھولتا جائے۔ یہی ذات حق کا منشا بھی ہے۔ صوفیانے لوگوں کو عمل سے بیزار بنا دیا دنیا کے فانی ہونے پر اتنا زیادہ اصرار کیا گیا کہ لوگوں کے دلوں سے عمل کا جذبہ زائل ہو گیا۔ قرآن عمل کی تلقین کرتا ہے خودی کو زائل کرنا اور بے عمل کی زندگی گذارنا اسلام کی تعلیم اور قرآن کا پیغام نہیں۔ اقبال بڑے یقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ فلسفہ اسلام میں ویدانت، بدھ مذہب اور یونان کے راستے سے آیا ہے۔ قوم مسلم میں زندگی کی نئی لہر دوڑانے کے لیے اقبال نے اسے دوبارہ قرآن کی اصل کی طرف رجوع کرنے اور اس کی خودی کو

بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ مسلمانوں کے زوال سے اقبال اتنے دلگیر ہوگئے تھے کہ انھوں نے شاعری کو شوق فضول جان کر اسے ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پروفیسر آرنلڈ نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔

(میرے خیال میں) اقبال کی یہ دلیل تاریخی اعتبار سے قابل قبول نہیں کہ تصوف کے چلن کی وجہ سے مسلمان حکومت اور اقتدار سے محروم ہوگئے اور مسلم قوم زوال پذیر ہوئی کیوں کہ تصوف کے چاروں اہم سلاسل کی مقبولیت کے عروج کا زمانہ مسلمانوں کے سیاسی عروج کا زمانہ ہے، دور کیوں جایئے یہاں بھارت کے پہلے صوفی علی ہجویری، غزنوی کے دور میں گزرے ہیں۔ نظام الدین اولیا ان کے مرشد فرید الدین گنج شکر، ان کے مرشد قطب الدین بختیار کاکی اور ان کے مرشد اجمیر کے خواجہ معین الدین چشتی تیرھویں اور چودھویں صدی میں گذرے ہیں۔ جنوبی ہند کے مشہور صوفی، نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید خواجہ بندہ نواز بہمنیوں کے عروج کے زمانے میں گذرے ہیں۔

مسلمانوں کی روایت پسندی کے علاوہ دو اور وجوہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلم سماج میں فرد کو آزادی فکر حاصل نہیں (جو اسلام کی عطا کردہ تھی اور دوسرے یہ کہ یہ سماج ترقی کے راستے کی طرف لے جانے والی اقدار کو اختیار کرنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ بغداد کے خلیفہ کے عہد میں آزادی حاصل تھی اور مذہب کو غور و فکر کے دائرے سے باہر نہیں رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں عربوں نے مختلف علوم و فنون میں بے مثل کارہائے نمایاں انجام دیئے اس عہد کو مسلمانوں کا صحیح معنوں میں سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔ لیکن حرکت کے بجائے روایت پسندوں کے غلبہ کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ فرد کی آزادیاں چھن گئیں، اور ان کی ترقی کی راہیں محدود ہوتی چلی گئیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں دوسری قومیں آگے بڑھنے لگیں اور ان کے مقابلے میں روایت سے بندھا ہوا مسلم سماج پچھڑ گیا۔

اقبال کا فلسفہ خودی: مسلمانوں کے زوال کے اسباب کے بارے میں اقبال کے نقاطہ نظر سے ہٹ کر اقبال کی اہمیت ہمارے نزدیک مسلم ہے، کیوں کہ اس نے انسانیت و عمل کا پیغام اور خودی کا فلسفہ دیا ہے۔ ان کے اس فلسفے اور پیغام کی بدولت اقبال کو بجا طور پر عالمی سطح کے عظیم شاعروں کی صف میں جگہ عطا کی گئی ہے۔

اقبال کا خودی کا فلسفہ کسی ایک مذہب سے علاقہ نہیں رکھتا اس کی رو سے آدمی کی تخلیق خالق کائینات کی اہم ترین تخلیق ہے جس دن آدم کو جنت سے نکالا گیا اس دن سے آج تک انسان اپنی خودی کے اثبات کے لیے کوشاں ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ خدا سے لو لگائے اور اپنی خودی کو بیدار کرے اسے یکے بعد دیگرے فطرت کے اسرار کی عقدہ کشائی کرنی ہے اور اس کام کے لیے عمریں درکار ہیں۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اقبال نے خودی کا لفظ ایک سے زائد معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لفظ کے لغوی معنی انا کے ہیں لیکن اقبال کا خودی کا تصور انا سے مبرا ہے۔ بعض اشعار میں انھوں نے اس لفظ کو انسانی وجود کے معنوں میں استعمال کیا ہے تو بعض مقامات پر اس سے توحید کے معنی مراد لیے ہیں۔

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں۔ یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا بعض اشعار میں اس لفظ کو جذبہ عزت نفس کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

میرے نزدیک اقبال خودی سے جو معنی مراد لیتے ہیں اس کے اظہار کے لیے مناسب و موزوں ترین لفظ [illegible] ہے۔ اقبال [illegible] کے پرکٹ ہونے اور بیدار ہونے کی بات کرتے ہیں۔ بعید نہیں کہ اقبال نے کشمیری شیو سمپردایہ کے

مصنف وسوگپت کی تصنیت پسند شاستر سے استفادہ کیا ہو۔

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیدارئی کائینات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوں
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

ایک اور جگہ اقبال لکھتے ہیں

خودی کی یہ ہے منزل اولین
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تیری آگ اس خاک داں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جایہ کوہ گراں توڑکر
طلسم زماں و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تیری شوخی فکرو کردار کا

خودی کا پیغام اور اس کی تعلیم کو کلام اقبال کے محاسن میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اقبال کا یہ پیغام تمام عالم انسانیت کے لئے ہے۔اقبال سے پہلے اس پیغام کو اس قدر مہارت اور سلیقے سے اردو ادب میں کسی نے پیش نہیں کیا۔

اقبال نے ۲۱۔اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔انھوں نے اردو زبان کی عظمت کو چار چند لگائے۔ان کا کلام آج بھی دلوں پر اثر کرتا ہے۔

ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی

فکر اقبال میں ہندی عناصر

اقبال ایک عظیم شاعر اور عالمگیر شخصیت کے حامل تھے لیکن ہم نے ان کی ہمہ گیر شخصیت کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی اصل عظمت کو سمجھنے سے انکار کیا ہے۔ ان کی شاعری کو مختلف حیثیتوں سے ہدف ملامت بنایا جاتا رہا ہے، تقسیم وطن کے بعد ان پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ فرقہ پرست شاعر تھے، ان کا دل اپنی قوم اور وطن کی محبت سے خالی تھا۔ انہوں نے قومیت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے، اس جذبہ کے تحت دوسرے شاعروں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور اقبال کو باقاعدہ گرانے کی کوشش کی گئی اور یاد اقبال کو ایک غیر ملکی یا غیر وطنی نوعیت کا کام تصور کر لیا گیا حالانکہ اگر معترضین اقبال خود ان کے کلام کا غائر مطالعہ کرے تو ان پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی کہ یہ ان کی تنگ نظری اور خام خیالی ہے۔

اقبال کو ہندوستان کی سرزمین سے، یہاں کے رشیوں اور منیوں اور یہاں کی ہر چیز سے والہانہ عشق تھا جس کی مثال اردو کے دوسرے شاعروں کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ اقبال کس پایہ کے ہندوستانی تھے قوم و وطن کی محبت ان کی شاعری میں کس درجہ کارفرما ہے، آئندہ سطور میں ان پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے گی۔

اقبال کی جڑیں خالص ہندوستانی ہیں۔ غالب کی لم تورانی ہونے پر انہیں ناز نہ تھا، اقبال کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے معزز گھرانے سے تھا آپ کی گوتر سپرو تھی، آپ کے اجداد سترہویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ برہمن زادہ ہونے کا انہیں ہمیشہ ناز رہا جس کا انہوں نے برملا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند

جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

اور ایک جگہ لکھتے ہیں

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے ردم و تبریز است

اقبال اور حب قوم وطن:۔ قوم و وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جس سے انسان کیا حیوان بھی خالی نہیں ہیں۔ اقبال کے دل میں قوم و وطن کی محبت بدرجہ اتم موجود تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی رح سے وطنیت کے مسئلہ پر علامہ اقبال کی بحث انتقال سے دو چار برس پہلے ہی کی بات ہے اس میں آپ فرماتے ہیں۔

"ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرہ ارض کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے، ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے، وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔"

آزادی ہند کے بعد اقبال پر ان اعتراضات کی تردید کرنے والوں میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے فکر اقبال میں ہندوستانی عناصر تلاش کرنے میں بڑی کاوش کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مضمون "شعر اقبال میں ہندوستانی پس منظر" سے ایک اقتباس یہاں پیش کیا جائے۔

"اگر معترضین اقبال کا ذکر اوروں کی زبان سے سننے کے عوض خود اقبال کے کلام کی جانب رجوع کرتے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی کہ اس عنصر کی تجلیاں جسے ہم قومی پس منظر کے نام سے منسوب کرتے ہیں کلام اقبال کے صفحات میں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں اور ۱۸۵۷ سے لیکر جب کہ ہماری شاعری میں پہلی بار

سیاسی شعور کی جھلکیاں نظر آئیں آج تک شاید ہی کوئی اردو و فارسی کا ہندوستانی شاعر ایسا نظر آئے گا جس نے قدیم بھارتی سنسکرتی کو اس احترام کی نگاہ سے دیکھا ہو جس سے علامہ اقبال نے دیکھا ہے اور اس سے اس قدر فیض حاصل کیا ہو جس قدر اقبال نے کیا ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں

"ہندوستان اور اس کے تمدن سے وابستگی کا مطلب جو حضرات محض بیکار قسم کی نعرہ بازی سمجھتے ہیں یا اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آگے کی جانب قدم بڑھانے کے عوض پیچھے کو چلنا شروع کر دیں یا ہندوستانی تمدن کا شور مچا کر ہم اپنے ملک کی اس خوبصورتی کو ختم کر دیں جو گلہائے رنگ رنگ کی صورت میں ہمارے وطن عزیز کے چمنستان میں نظر آرہی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ایسے حضرات کو کلام اقبال میں ہندوستان سے وابستگی کی تصویریں نظر نہ آئیں گی لیکن اگر ہندوستانی تمدن سے مراد عظیم قومی، وطنی اور مذہبی روایات میں وہ فلسفہ ہے جو وید اپنشد، رشیوں منیوں، فقیروں اور درویشوں کے اقوال اور سیرت کی صورت میں ایک قیمتی ورثے کے طور پر ہم تک پہنچا ہے تو اس قیمتی ورثے سے اقبال کی محبت بلکہ عشق بے پایاں ان معترضین کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے جو ذکر اقبال کو محض ایک ہوا سمجھتے ہیں۔"

علامہ اقبال کی اس وطنی محبت کا ثبوت ان کی تصانیف سے بخوبی ملتا ہے، بانگ درا اقبال کا پہلا مجموعہ کلام ہے اس کی سب سے پہلی نظم "ہمالہ" ہے اس نظم سے اقبال کی وطن دوستی اور ہندوستان سے بے پناہ پیار اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے یہ علامہ اقبال کی ۱۹۰۱ء کی نظم ہے اور قریب قریب یہی ان کی شاعری کے آغاز کا سال ہے۔ یہ نظم وطن سے سراپا محبت و عقیدت کی غماز ہے۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

ہندوستان کی تاریخ، تہذیب اور جغرافیائی وحدت میں ہمالہ کو جو مقام حاصل رہا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے، وہ عہد ماضی میں ہمارا سوتری و پاسبان رہا ہے۔ گردش شام و سحر اس پر آج تک اثر انداز نہ ہو سکی ہے، اقبال سارے عہد کہن کی وہ داستان سننے پر اکتفا نہیں کرتے جب کہ اس کا دامن مسکن آباد انسان بنا بلکہ یہ آرزو بھی بے تابانہ ان کی زبان پر آگئی ہے۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

یہ گردش ایام ہندوستان کے اس دور کے تمدن کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جب کہ ملک ہزاروں سال پہلے چشم بینا کے پردہ تہذیب پر روشنی کا مینار بن کر ابھرا تھا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

"اقبال کو جلال و جبروت کے اس عظیم پیکر میں متعدد وجوہ سے بڑی دلکشی محسوس ہوتی ہے، ہمالہ کو ان کی طبیعت سے بڑا شغف تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے گوہر مراد سے قریب تر ہیں۔ عہد کہن کی داستان سرائی سے وہ ذہنی سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کتاب میں نو اشعار کی ایک نظم "صدائے درد" کے عنوان سے ہے۔ یہ دراصل ۲۵ اشعار کی نظم ہے جس کے آخری سولہ اشعار بانگ درا میں شامل نہیں ہیں یہاں پر اس نظم کے شروع کے پانچ اور باقی ۱۶ اشعار پیش کئے جاتے ہیں، اس نظم میں اقبال ملک کے لوگوں میں نفاق اور نفرت کے جذبے کے شاکی ہیں اور ہندوستانیوں

کے آپسی اتحاد کو آزادی وطن کی اول شرط قرار دیتے ہیں۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبودے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں
لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں
پار لے چل مجھ کو پھر اے کشتی موج انلک
اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک
ہاں سلام اے مولد بوذ اسف گوتم تجھے
اب فضا تیری نظر آتی ہے نامحرم مجھے
الوداع اے سیر گاہ شیخ شیراز الوداع
اے دیار بالمیک نکتہ پرداز الوداع
الوداع اے مدفن ہجویری اعجاز دم
رخصت اے آرام گاہ شکر جادو رقم
الوداع اے سرزمین نانک شیریں زباں
رخصت اے آرام گاہ چشتی عیسیٰ نشاں

اقبال کے مندرجہ بالا اشعار کی معنویت آج بھی جوں کی توں برقرار ہے، موجودہ ہندوستان کشت و خون کے جس دور سے گذر رہا ہے یہ اشعار اس کا ماتم بھی ہیں اور

رمز الفت سے مرے اہل وطن غافل ہوئے
کارزار عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے
اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں ، کیا انسان ہیں
غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب نادان ہیں
جس کا ایک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے
صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے
دل حزیں ہے ، جان رہن رنج بے اندازہ ہے
آہ اک دفتر ہے اپنا وہ بھی بے شیرازہ ہے
امتیاز قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ
اور اس الجھی ہوئی گتھی کو الجھاتے ہیں یہ
ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جو من نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خون آبائی رگ تن سے نکل سکتا نہیں
اصل محبوب ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاض نظم ہستی کی ہیں تصویریں سبھی
ایک ہی شئے سے مگر یہ چشم دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

اس کے فوراً بعد ہی بانگ درا میں جو نظم ہے اس کا عنوان "آفتاب (۱۹۰۲ء) ہے (یہ گایتری منتر کا ترجمہ ہے) گایتری کا منتر رگ وید کے تیسرے منڈل کے بھجن ۶۲۰ کے

دسویں اشلوک میں آیا ہے۔ منتر کی اصل عبارت یوں ہے۔

اوم بھو بھوانت سوتیر ورے نیم بھرگو دیود سادھی نہی دھیو یونہا پرچودیات۔"

ترجمہ:۔ وہ جو ساری کائنات کا خالق ہے وہی اس لائق ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ جو ساری چمکدار اشیاء کا خزانہ ہے، نور کا منبع ہے ہم اس کا ذکر کرتے ہیں (اور اسی سے دعا مانگتے ہیں) کہ وہ ہماری عقل کو راہ راست پہ چلائے۔

اقبال نے مذکورہ نظم "مخزن" میں شائع کی تھی۔ اس نظم کا ایک مصرعہ ہے۔

زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو

زائیدگان نور کی تشریح کرتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں۔

"زائیدگان نور یعنی دیوتا" سنسکرت میں لفظ دیوتا زائدہ نور ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے ازلی نہیں سمجھتے تھے، غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیوں کہ فرشتوں کا وجود نوری تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے، پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانتا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔"

اس منتر کا ترجمہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں۔

"ترجمہ کرنے کو تو میں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ سن نے پوپ کا ترجمہ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گائتری نہیں۔"

گایتری کے منتر کا ترجمہ دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اقبال ایک فرقہ پرست تنگ نظر و متعصب شاعر تھے، صرف یہی نہیں اس سے ان کا وسیع مطالعہ اور ہندو مذہب کو

سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی غمازی کرتا ہے، ہندو مذہب کو شرک کا مجرم نہ گردانتا، اس سے بڑھ کر وسیع القلبی اور وسیع النظری کیا ہو سکتی ہے۔ اس دور کی ایک اہم نظم "تصویر درد" ہے جو ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے، اس نظم میں اقبال اہل وطن سے کہتے ہیں۔

"تمیز ملت و آئین نے قوموں کو اجاڑ دیا ہے اب وقت ہے اسے ترک کر کے مرے اہل وطن کچھ فکر وطن کی طرف متوجہ ہوں۔"

سامراجی طاقتیں ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہیں، اقبال اس سلسلہ کو ختم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
ہوائے ، امتیاز ملت و آئیں کی موجوں نے
غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے تو اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں اخوت و محبت کی فرمانروائی دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کو درد و غم کا مداوا سمجھتے ہیں۔

"سرگذشت آدم" میں بھی اقبال نے ہندوستان کو فراموش نہیں کیا ہے اور آدم کی زبان سے یہ کہلوایا کہ میں نے ہندوستان میں آکر سرود ربانی سنایا۔

اس کے بعد اقبال کی شہرہ آفاق اور زبان زد خاص و عام نظم "ترانہ ہندی" آتی ہے، وطن کی محبت سے متعلق اتنی بہتر نظم ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں مشکل سے ملے گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کو مکمل طور پر نقل کر دیا جائے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی ، دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا ، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں ، اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

"ہندوستانی بچوں کا گیت" بھی اچھی نظم ہے، اس نظم میں شاعر بچوں کی زبان سے کہلاتا ہے کہ میرا وطن ہندوستان وہی ہے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح نے پیغام حق سنایا۔ نانک نے جس میں وحدت کا گیت گایا۔ دنیا نے وحدت کی لے یہیں سے سنی تھی اور سرور کائنات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈی ہوا یہیں سے آئی تھی مصرعہ۔

نیر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

یہ دونوں نظمیں وطن سے محبت کی ایک اعلیٰ وارفع مثال ہیں۔

اس نظم کے معاً بعد ایک دوسری خوبصورت نظم "نیا شوالہ" ہے اس نظم میں حب وطن کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہے، اس جذبے میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع نہیں ہے بلکہ ایک فطری بہاؤ ہے، مولوی محمد طاہر فاروقی رقمطراز ہیں۔

"وہ ابنائے وطن کو افتادگی، نفاق، افتراق، تعصب، بے علمی، تنگ نظری اور کج بینی کے غاروں میں گرا ہوا پاتا تھا، ان کو عبرت دلاتا ہے اور نصیحت کرتا ہے کہ وہ محبت و اتفاق، بلند خیالی، و علو ہمتی پیدا کریں، حقیقت بیں نظر پیدا کر لیں اور اپنے مستقبل کو روشن و شاندار بنا سکیں۔"

اس نظم کے متعلق عزیز احمد لکھتے ہیں۔

"بہرحال "اتفاق" اقبال کی اس وطنی شاعری کا سب سے بڑا محرک جذبہ ہے، سب سے اہم موضوع ہے اور اس زمانے میں ان کی رائے کے خلوص سے انکار کرنا ناممکن ہے، اتفاق کے موضوع پر ان کی بہترین اور دلکش ترین نظم "نیا شوالہ" ہے۔ یہ نظم خیالات کی تعمیر، اپنی نادر تشبیہات اور اپنے پر خلوص اور پر جوش لیکن انوکھے انداز بیان کی وجہ سے اقبال کی سب نظموں سے مختلف ہے ۔۔۔ ہندو مسلم اتحاد کے موضوع کے اعتبار سے ہندی الفاظ اقبال نے جس کاریگری سے جڑے ہیں ان کا کوئی اور نمونہ نظیر اکبرآبادی کے بعد، عظمت اللہ خاں سے پہلے اقبال کی اس نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اقبال کی کوئی اور نظم ایسی نہیں جس میں ہندی الفاظ کو اس بے تکلفی اور شیرینی سے برتا گیا ہو۔

اس کا خلوص، اس کا جوش، آج بھی اردو زبان میں وطنی شاعری کا بلند ترین نقطہ ہے۔

پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اردو شاعروں پر بالعموم یہ الزام لگایا جاتا ہے انہیں ہندوستان سے زیادہ عرب و ایران کی چیزیں بھاتی ہیں، وہ ہندوستان کی گنگا و جمنا کے مقابلہ میں دجلہ و فرات کا ذکر زیادہ کرتے ہیں لیکن اقبال کے کلام سے ان الزامات کی تردید ہوتی ہے، دریائے کاویری ان کی نگاہ میں جیحون و فراط سے زیادہ عزیز تھی، سلطان ٹیپو کی زبان سے کہتے ہیں۔

رود کاویری یکے نرمک خرام
جستہ شاید کہ از سیر دوام
در کہستاں عمر ہا نالیدہ
راہ خودرا برمژہ کاویدہ
اے مرا خوشتر زجیحون و فرات
اے دکن را آب تو آب حیات

بانگ درا میں نظم "کنار راوی" میں لکھتے ہیں۔

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

ہندوستان کے صلحاء و اخیار امت سے عقیدت

اقبال کے دل میں ہندوستان کے صلحاء و اخیار کی پوری عظمت و عقیدت تھی جس پر شری رام چندر جی، گوتم بدھ اور گرونانک کی شان میں ان کی نظمیں اس بات کا بین ثبوت ہیں، ان نظموں کا واحد مقصد ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانا تھا، وہ ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکجہتی اور ہم آہنگی پر زور دیتے رہے۔ اقبال نے بلا امتیاز مذہب و ملت دنیا کے عظیم المرتبت انسانوں کا ذکر کیا ہے۔ جن لوگوں کی تعریف کی گئی ہے ان کی کوئی نہ کوئی بات ان کو پسند آگئی ہے۔ یہ ان کا ایک عام مذاق اور رجحان تھا مثلاً نظم رام میں ہندوستانی فلسفے کی تعریف کے بعد رامچندر جی کی عظمت جس طرح بیان کی گئی ہے اور انہیں "امام ہند" کے لقب سے

نوازا گیا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

یہ ہندیوں کی فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے اونچا ہے بام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے وہی
روشن تر از سحر ہے زمانہ میں شان ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش شجاعت میں مرد تھا

قدیم ہندوستان کے تاریک دور میں یہاں کی افسوس ناک حالت کا نقشہ اور گوتم بدھ اور گرونانک کی اصلاحی کوشش اور ان کی روحانی تعلیمات ملاحظہ ہوں، نظم نانک کی محرک پیغام توحید ہے جو گرونانک کی تعلیم کی روح رواں ہے۔ پوری نظم ملاحظہ ہو۔

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پرواہ نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ بد قسمت رہے آواز حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارش رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ۔ شودر کے لئے ہندوستاں غم خانہ ہے
دور انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے ابتک مئے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں
بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا ، توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

سوامی رامانند تیرتھ ہندوؤں کے مشہور مذہبی رہنما تھے۔ان کے یہاں شروع ہی سے ویدانت کا رنگ غالب تھا۔یہ ویدانت (وحدت الوجود) وہ تھا جس کی ابتدا ہندوستان میں شنکر اچاریہ نے کی، رام تیرتھ عمر کی پختگی کے ساتھ رامچندر جی کی محبت میں غرق ہوتے گئے یہاں تک کہ غرق دریا ہوگئے۔اقبال کی نظم سوامی رام تیرتھ کا محرک ان کا "لا" اور "الا" کا عشق ہے اس عشق کی تعلیم سے سوامی تیرتھ نے اسرار کائنات کو آشکار کیا۔وہ کہتے ہیں

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرہ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الااللہ کا
توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیٔ تسنیم عشق

اقبال پر متعصب قسم کے تنگ نظر مصنفین کا الزام ہے کہ اقبال اپنے ابتدائی کلام میں تو وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار تھے لیکن یورپ کی واپسی کے بعد ان کے نظریہ وطنیت میں فرق آگیا تھا اور وہ صرف اسلام پسند ہوگئے تھے۔ان کی اسلام پسندی سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن محدود وطنیت کے نظریہ کے آپ شدید مخالف ہیں اور اقوام وملل کے حق میں اس کو سم قاتل سمجھتے ہیں، مولوی محمد طاہر

فاروقی رقمطراز ہیں۔

"وطنیت کا یہ مفہوم کہ ہندی، عراقی، خراسانی، افغانی، روس وغیرہ ہونے کے اعتبار سے ہر فرد کو اپنے وطن ولادت سے تعلق اور نسبت ہے اور اس لیے اس کو اپنے وطن کی خدمت کرنی چاہیئے اور قربانیوں سے دریغ نہ کرنا چاہیئے، اس کے آپ قائل اور معترف ہیں۔" ہندی ترانہ" لکھنے کے وقت بھی آپ کی رائے یہی تھی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں وفات سے ڈیڑھ مہینہ پہلے جب آپ نے محولا بالا مضمون سپرد قلم کیا ہے اس وقت بھی آپ کی رائے میں تغیر نہ ہوا تھا۔ ان اشعار میں وطن کی محبت کا جذبہ ہر ہر لفظ سے ٹپکا پڑتا ہے۔

تھے کیا دیدہ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
دکھادوں گا میں اے ہندوستاں رنگ وفا سب کو
کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کرکے چھوڑوں گا

"پیام مشرق" صرف کشمیر اور غنی کاشمیری کے ذکر ہی سے مملو نہیں بلکہ اقبال ہندوستان کی غلامی سے متعلق ان تمام ممتاز شخصیتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جنہوں نے ملک کی آزادی میں حصہ لیا۔

زبور عجم میں مشہور ہندو ویدانت فلسفی شنکر اچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دگر از شنکر منصور کم گوئے
خدا را ہم بہ راہ خویشتن جوئے

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی "تلمیحات و اشادات اقبال" میں رقمطراز ہیں۔

"شنکر ہمہ اوست کے نظریہ کا مفسر ہے لیکن ہمہ اوست سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ کثرت ہی جس میں وحدت ظاہر ہو گئی

ہے ۔ حقیقت ہے اور وحدت کا وجود کثرت کے ماورا نہیں اور دوسرے یہ کہ چونکہ کثرت کا اپنا وجود نہیں بلکہ کثرت میں وحدت کے ظہور سے وجود پیدا ہے لہذا کثرت نمود محض ہے اور حقیقت وحدت ہی ہے، شنکر کو دوسرے پہلو پر اصرار ہے لہذا کثرت کو نمود بے بود کہنے پر مصر ہے۔"

"جاوید نامہ" فارسی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیائے شعر کی معراج کہا جا سکتا ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو سید سلیمان ندوی مرحوم نے فرمایا تھا کہ اس وقت تک فارسی ادب کی چار کتابوں کو بقائے دوام حاصل تھی اب ان کی تعداد پانچ ہو گئی ہے اور وہ چار کتابیں یہ تھیں۔

(۱) شاہنامہ فردوسی (۲) دیوان حافظ (۳) مثنوی مولانا روم (۴) گلستان سعدی

اس کتاب میں زندہ رود جو اقبال نے اپنا نام رکھا ہے پیر رومی کی قیادت میں افلاک کی سیر کرتا ہے اور فلک قمر پر ایک ہندوستانی درویش سے ملاقات ہوتی ہے۔ اہل ہند اس کو "جہاں دوست" یعنی وشوامتر" کہتے ہیں، اس سلسلے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مندرجہ ذیل بیان قابل توجہ ہے اور وشوامتر کے کردار پر نئی روشنی ڈالتا ہے۔

"اب اس سفر کی تفصیل بیان کرنے اور اس کے متعلق بات چیت کرنے سے پیشتر میں ایک عام غلطی کی جانب جس کے اکثر نقاد اور شارحین مرتکب ہوئے ہیں سامعین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں "جہاں دوست" کا لغت کی رو سے ترجمہ کرتے وقت عام طور پر اس کے معنی "وشوامتر" لکھ دئے گئے ہیں لیکن علامہ کے اشعار میں "جہاں دوست کی جو وضاحت کی گئی ہے اس سے یہ راز کھلتا ہے "جہاں دوست" وشوامتر نہیں بلکہ شیوجی مہاراج ہیں اور چونکہ شیوجی مہاراج کی متعدد صفات میں "جہاں دوستی" بھی ایک صفت ہے اس کے موقع

و محل کی مناسبت سے علامہ نے انہیں "جہاں دوست" کہا ہے۔یہاں اقبال کے اشعار کی جانب رجوع کرنا مناسب ہوگا کہتے ہیں۔

زیر نخلے عارف ہندی نژاد
دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد
موئے برسربستہ و عریاں بدن
گرد او مارے سفیدے حلقہ زن

یہ مارے سفید حلقہ زن اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ مذکورہ شخصیت وشوامتر نہیں بلکہ پاروتی کے شوہر شیوجی مہاراج ہیں، نیز شیوجی مہاراج کے بارے میں ہندو دیومالا کی روایت کو بھی پیش نظر رکھنا لازمی ہے جو یہ کہتی ہے کہ شیوجی مہاراج کے ماتھے میں چاند ہے۔یہی سبب ہے کہ علامہ اقبال کی ملاقات شیوجی سے فلک قمر پر ہوتی ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مجھے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ شیوجی مہاراج کا بطور ایک فلسفی اور روحانی رہنما کے علامہ اقبال کی نظر میں کیا مقام ہے اور اس فلسفے کے باریک نکات کو جسے ہندوستانی فلسفہ یا ہندو فلسفہ کہا جاتا ہے اقبال نے شیوجی کی زبان سے بیان کر کے کس طرح سے فارسی شعر و ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔یہ وہ سعادت ہے جو اقبال کے علاوہ اور کسی ہندوستانی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اور بھارتی سنسکرتی کے تحفظ اور نشر و اشاعت کا دعویٰ کرنے والے تو شاید اس مقام کے قریب ہی کبھی نہ پہنچ ہوں گے۔

اس طویل اقتباس کا مطلب صرف یہ واضح کرنا تھا کہ اقبال کو ہندو مذہب و فلسفہ سے کسقدر دلچسپی تھی۔

یہ سفر بڑا طویل ہے اس نظم کے ساتھ ساتھ ہم جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں

اقبال کی حب الوطنی روشن سے روشن تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ پھر وادی طواسین میں پہنچتے ہیں وہاں طاسین گوتم بھی آتا ہے۔ اقبال دوسرے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ گوتم بدھ کی تعلیمات کو بھی ان کی زبان سے پیش کرتے ہیں۔ فلک زحل پر وہ خبیث روحیں جن کو دوزخ بھی قبول نہیں کرتی اس میں جعفر بنگالی و صادق دکن جیسے غدار اور قوم فروش بھی ان کو نظر آتے ہیں۔

بعد ازیں ماورائے فلک پر رسائی ہوتی ہے اور یہاں دوسروں کے علاوہ ہندوستان کے مشہور شاعر بھرتری ہری سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ بھرتری ہری وہی ہیں جن کے اس شعر سے اقبال نے اپنے مجموعہ کلام "بال جبرئیل کی ابتدا کی ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم نازک بے اثر

بھرتری ہری اقبال کو وہ پیغام دیتے ہیں جسے گیتا کی تعلیم کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ بھرتری ہری کے بعد ٹیپو سلطان سے ملاقات ہوتی ہے۔ ٹیپو سلطان کاویری سے متعلق کہتے ہیں

اے مرا خوشتر زجیحون و فرات
اے دکن را آب تو آب حیات

اس کے بعد غنی کاشمیری کی زبان سے عوام کو ملوکیت کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتے ہیں اور کھلے الفاظ میں نہرو خاندان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

آں برہمن زادگان زندہ دل
لالہ احمر زروئے شان خجل
تیز بیں و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شان از خاک دامن گیر ماست
مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

اس قسم کی مثالیں صرف "جاوید نامہ" ہی میں نہیں بلکہ اقبال کی بعد کی

تصنیفات میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔

آزادی کی جنگ میں جب مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور حکیم اجمل خاں وغیرہ کو گرفتار کیا گیا تھا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، جسمانی طور پر تو نہیں لیکن فکری طور پر وہ یقیناً ان لوگوں کے قریب رہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں فطرت پسند
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

جلیانوالا باغ کا جو واقعہ پیش آیا اس نے اقبال کے سکون کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اقبال نے ان شہیدوں کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ کئی نظموں اور مقالات پر بھاری ہے۔ یہ اشعار اقبال کے مطبوعہ کلام میں درج نہیں ہیں لیکن یہاں شامل کئے جاتے ہیں۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

"ضرب کلیم" اقبال کی آخری تصانیف میں سے ایک ہے۔ اس میں ایک نظم "شعاع امید" ہے اس نظم کا آخری بند جو کہ ہندوستان کی محبت کا نقش آخر ہے۔ نذر ناظرین کی جاتی ہے۔

اک شوخ کرن شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

چھوڑونگی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خاک سے مرداں گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خذف ریزہ در ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جس کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانہ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلمان تہہ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

"ارمغان حجاز" اقبال کا آخری مجموعہ کلام ہے جو اس عظیم شاعر نے انسانیت کو پیش کیا ہے۔ عالمگیر محبت کا جو جذبہ اقبال کی شاعری میں جاری و ساری ہے اور حب وطن کی وہ کیفیت جس سے اقبال سرشار ہے "ارمغان حجاز" میں بھی پورے طور سے موجود ہے۔

حوالے

۱، ۲) اقبال اور اس کا عہد از جگن ناتھ آزاد ص ۱۷ تا ۱۹
۳) مضمون "قومی تصورات" ماخوذ از اقبال کے ابتدائی افکار از ڈاکٹر عبدالحق ص ۱۴
۴، ۵) مضمون "شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر" تصنیف اقبال اور اس کا عہد از جگن ناتھ آزاد ص ۲۲ اور تلمیحات و اشارات اقبال از ڈاکٹر اکبر حسین قریشی ص ۱۴۲
۶) گایتری کا ترجمہ از علامہ اقبال منقول از "مخزن" ماہ اگست ۱۹۰۲ء

۷) سیرت اقبال از مولوی محمد طاہر فاروقی ص ۱۱۸
۸) اقبال، نئی تشکیل از عزیز احمد ص ۲۱
۹) سیرت اقبال از مولوی محمد طاہر فاروقی
۱۰) تلمیحات اشارات اقبال از ڈاکٹر اکبر حسین قریشی
۱۱) مضمون "شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر، تصنیف اقبال اور اس کا عہد از جگن ناتھ آزاد

سید اختر علی تلہری

اقبال

سچدانند سہنا کی نظر میں

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ و پیام کی تشریح کے سلسلے میں اب تک ہزاروں صفحے لکھے جاچکے ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیشتر خاص طرح کے جذبہ عقیدت مندی کے تحت۔ اس لیے اس کی حیثیت تقریظی حدوں سے آگے نہ بڑھ سکی ہے۔ ایسا ہونا کچھ زیادہ تعجب کے قابل بھی نہیں ہے، کیوں کہ اقبال کی شاعری کے رباب سے جو زمزمے نکلے تھے ان کے لہجے میں فلسفہ و مذہب کی مخصوص نوعیت کی آمیزش نے سامعین پر اچھا خاصا سحر کر دیا تھا، او اس سحر زدگی نے ان سے انتقادی تحلیل اور تخریب کی صلاحیت بالکل سلب کر لی تھی۔ ایسی فضا میں آفریں و مرحبا و احسنت کے سوا کوئی اور آواز سنائی ہی کیا دے سکتی ہے۔

ڈاکٹر سچدانند سہنا جو دوسرے اہم مختلف سیاسی منصبوں پر فائز ہونے کے علاوہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے عارضی صدر بھی رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی ان نامور ہستیوں میں سے تھے جنہیں بیک وقت سیاست و ادب پر اقتدار حاصل تھا انہیں انگریزی زبان و ادب پر عبور کے ساتھ فارسی اور اردو کا بھی غیر معمولی ذوق تھا۔ انہوں نے علامہ اقبال کو قریب سے دیکھا تھا، ان کی شاعری کو انہوں نے اچھے طریقے سے سنا تھا، پڑھا تھا اور اس شاعر اعظم کو اس کے مداحوں کی طرف سے تحسین و تحمید کا جو خراج پیش کیا گیا تھا اس کا ایک انصاف پسند نقاد کی حیثیت سے جائزہ بھی لیا تھا۔ ایسے شخص کو اقبال کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنا ہی چاہیئے تھی۔ ڈاکٹر سہنا کے ادبی مزاج کی تشکیل میں منطقیت بڑی حد تک شریک تھی۔ اس لیے ان کی نگاہ میں تقریظی نگارشوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ہر ادبی شاہکار کو اپنے تنقیدی تجزیہ تحلیل کی کسوٹی پر کستے تھے۔ لیکن ان کی اس تنقید میں مذہبی و

قومی تعصب یا فرقہ واریت کے رجحان کو دخل نہ ہوتا تھا۔ان کی تنقیدیں اس قسم کی آمیزشوں سے پاک و صاف ہوتی تھیں۔" اقبال دی پوئٹ اینڈ ہز مسیج " پان سو بارہ صفحوں پر پھیلی ہوئی ضخیم و جسیم کتاب ڈاکٹر صاحب کی اس غیر معمولی وسعت نظر اور ان کی اس ادبی و تنقیدی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔

" اقبال دی پوئٹ اینڈ ہز مسیج " میں شاعر پر تقریظی زر و جواہر نثار نہیں کئے گئے ہیں۔یہ تو بہت کچھ ہو چکا ہے البتہ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شاعری پر مختلف گوشوں سے صحیح معنوں میں ایک سچے نقاد کی طرح نظر ڈالی جائے، ان کی شاعری کا ان کے فلسفے کا ان کے پیام کے بے لوث طریقے سے تحلیل و تجزیہ کیا جائے وہ خوش عقیدہ لوگ جو اقبال کے بارے میں تنقید کا ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے انہیں تو اس کتاب میں شاید خوش کن چیزیں نہ مل سکیں، کیوں کہ اس میں تحسین ناشناس کی بے معنی نمائش سے احتیاط برتتے ہوئے ایک بار ایک نظر " سخن شناس " کی حیثیت سے تنقید کا راستہ طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ہاں جو لوگ تنقیدی نگارشوں پر انصاف کی نظر ڈال سکتے ہیں انہیں اس کتاب میں اقبال کے متعلق غور کرنے کے لیے بہت کچھ سامان ملے گا۔زیر نظر کتاب کے مختلف قسم کے تعصبات کی آلائشوں سے پاک و صاف ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خود کتاب کے ابتدائی ابواب ہیں، جن میں ڈاکٹر سہنا نے سر تیج بہادر سپرو، سر مہدی ایسے معتبر ادیبوں کی وقیع رائیں تفصیل کے ساتھ اقبال کی عظمت کے اعتراف کے سلسلے میں پیش کر دی ہیں اور ان کے بیشتر حصے سے اپنے اتفاق کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ڈاکٹر رانجی جی سہانی انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے بلند پایہ عالم ہیں اور جہاں تک معلوم کیا جا سکا ہے فارسی اور اردو ادب میں بھی انہیں ناقدانہ ورک حاصل ہے۔نومبر ۱۹۴۳ء کو انہوں نے ایسٹ انڈیا اسوسی ایشن لندن کے ایک جلسہ میں جو مسٹر ای۔ایل مری دی ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کے مشہور اڈیٹر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ایک خطبہ " ہندوستان کے ادبی رجحان " کے عنوان سے پڑھا تھا۔اس خطبے میں ڈاکٹر سہانی نے ابتداً ٹیگور کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی بلند صوفیانہ اور فلسفیانہ حیثیت سے انکار کیا ہے اور انہیں صرف ایک بڑا شاعر مانا ہے۔ٹیگور کے متعلق سب

کچھ کہنے کے بعد انہوں نے اقبال کا تذکرہ کیا ہے اور بڑے ہی پر احترام لہجے میں کیا ہے۔
ڈاکٹر سہانی کے خیال میں اقبال کے "سخنہائے جانفزا" ٹیگور کی "متصوفانہ قیل و قال" کے مقابلے میں زیادہ اطمینان بخش، زیادہ تسلی بخش ہیں۔ انہیں تو ہندو ہونے کے باوجود اقبال کی اسلامیت میں بھی کوئی قابل اعتراض چیز نظر نہیں آتی۔ ان کی نگاہ میں اقبال کا فلسفۂ قسمت کے خلاف جنگ آزما ہونا ان کی شاعری کا بڑا ہی محبوب رخ ہے۔ وہ ہم میں شجاعت و حماست کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ عمل اور جدوجہد ان کی شاعری کا نصب العین ہے۔ یقیناً ڈاکٹر سہانی کے خیالات میں جہاں تک ٹیگور کا تعلق ہے "تفریظ" کا پہلو نمایاں ہے اور اقبال کے بارے میں ان کی رائیں "افراط" کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر سہنا نے بعینہٖ یہ تمام حصہ نقل کر دیا ہے۔ یہ سب ڈاکٹر صاحب کی کشادہ دلی کا ثبوت ہے اور اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کے بارے میں کوئی تعصب نہیں رکھتے۔ اقبال کے مخصوص خیالات سے ان کے مخصوص رجحانات سے ڈاکٹر صاحب کو خواہ مخواہ کی پرخاش نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں غیر جنبہ دار ہو کر انصاف پسند نقاد کی حیثیت سے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی تمام رایوں سے اتفاق کیا جائے۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جن سے ہم آہنگ ہونا مشکل ہے لیکن اس سے کتاب کی بلند ناقدانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر سہنا نے اس کتاب کو ۲۸ ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور ہر باب میں اقبال کی شاعری ان کے فلسفہ اور پیام کے کسی نہ کسی پہلو سے سیر حاصل بحث کی ہے ان سب کے بارے میں تو اجمالاً بھی ایک صحبت میں اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں صرف ڈاکٹر سہنا کے ان خیالات کا مختصر طور سے ذکر مقصود ہے جن کا تعلق اقبال کی اردو شاعری سے ہے۔ ڈاکٹر سہنا نے کتاب کے گیارھویں باب میں اقبال کی اردو شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سہنا کے خیالات کا تذکرہ کرنے سے پہلے ابتدا ہی میں عرض کر دوں کہ میرا یہ ہمیشہ سے عقیدہ ہے کہ اقبال کی حقیقی عظمت ہمیشہ ان کی شاعرانہ حیثیت ہی کی رہین منت رہے گی۔ اسی چشمے سے ان کی بزرگی کی جڑیں بقائے دوام کا پانی حاصل کرتی رہیں گی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کے غالی مداح انہیں مختلف راستوں سے فلسفی اعظم بنا دیں

اور وہ خود بھی ان تقریظوں سے اثر لے کر اپنے کو صرف ایک فلسفی ایک پیامبر قرار دے لیں۔ لیکن شاعر اقبال بہرحال شاعر ہی رہے گا فلسفی نہیں بن جائے گا۔ اس لیے اقبال پر تنقیدی نظر ڈالنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے اس کی شاعرانہ قدر و قیمت معین کریں اور اس کی دوسری حیثیتوں کی آڑ لے کر اس کی شاعرانہ حیثیت سے نظر بچا کر نہ گزریں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو میں یہ کہوں گا کہ اقبال کی فارسی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے وہ غالباً ان کی اردو شاعری سے زیادہ لطیف اور زیادہ شیریں ہے ان کے فارسی لہجے میں ترنم کہیں زیادہ خوش گوار اور دل پذیر ہے۔ ان کی سبک اور فارسی ترکیبیں خاصی دلاویزی کی کیفیت رکھتی ہیں۔ ان کا امتیازی وصف ان کی جاں نواز روانی اور ان کا خوبصورت ڈھلاؤ ہے۔ ان سب باتوں نے مل کر ان کے فارسی اشعار میں جو حلاوت، جو ملاحت پیدا کر دی ہے وہ ان کی اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ کے مصنف اقبال میں لہجے کا شاعرانہ شکوہ شاعرانہ جلال بہت زیادہ نمایاں تھا اور توقع تھی کہ شاعر اقبال شاعری کے اس نئے رنگ کو فروغ دے کر اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ دگنا چوگنا کر دے گا۔ لیکن حالات نے ایسا نہ ہونے دیا۔ علامہ اقبال کی بعد کی شاعری میں مستعار فلسفیانہ افکار کی کثرت اور اصلاح ملت کے خیالات کی افراط نے ان کے منظومات سے حقیقی شعریت کا رنگ روغن بڑی حد تک اڑا دیا۔ لہجے میں وہ شکوہ نہ رہا۔ وہ بانکپن نہ رہا، وہ لطافت نہ رہی، وہ ملاحت نہ رہی۔ تشبیہوں اور استعاروں سے وہ اب بھی کام لیتے تھے مگر مزعومہ فلسفیت کا رکھ رکھاؤ اور مصلحانہ پیامبری کا جوش ان میں برجستگی اور چلبلا پن نہ پیدا ہونے دیتا تھا۔ ان کی شاعری کی صباحت پھیکی پھیکی ہوتی تھی۔ ان کی شاعری کی ملاحت بے نمک معلوم ہوتی تھی۔ تو فارسی کے جا بجا اضافوں سے اب بھی کہیں کہیں ان کے اشعار میں حلاوت پیدا ہو جاتی مگر بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس میں گڑ گھول دیا گیا ہو۔ ان کے بعد کی اردو شاعری میں جو یہ سپاٹ پن پیدا ہو گیا تھا وہ تمام تر نتیجہ تھا ان کے اس خیال کا کہ وہ اب شاعر نہیں ہیں بلکہ حکیم ہیں، فلسفی ہیں، مصلح ہیں، مبلغ ہیں، صاحب پیغام ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ترکیبیں اردو کے مذاق کے لحاظ

سے سست ہیں، تشبیہوں میں شعریت کی روح نہیں ہے، بیان میں عجز کے پہلو نظر آتے ہیں۔ ان کے استعمال کردہ عربی اور فارسی کے جسیم و ضخیم الفاظ اردو کے لطیف ڈھلاؤ کے سانچے میں ٹھیک نہیں اترتے تو کوئی محل حیرت نہیں ہے۔ اقبال نے ان چیزوں کی طرف التفات ایک لخت ترک کر دیا تھا۔ وہ شعری فن کاری میں آب و رنگ پیدا کرنے کے لیے اپنا خون جگر صرف کرنا بے دانشی کا عمل سمجھنے لگے تھے۔ اسی قسم کی کم و بیش بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ڈاکٹر سہنا اقبال سے ان کے اردو شاعر ہونے کی حیثیت سے زیادہ متاثر تو نہیں ہو سکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں مولانا حالی اردو شاعر کی حیثیت سے جہاں تک ان کی مثنوی "مدو جزر اسلام" کا تعلق ہے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ ڈاکٹر سہنا نے اس باب کے آغاز میں داغ دہلوی کے یہ دو شعر درج کئے ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ان اشعار کے بعد سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کے وہ چند اقوال درج کئے ہیں جن میں سادہ اردو لکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ ان براعت استہلال پر مشتمل سطور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر سہنا ایک اچھے اردو شاعر سے کس قسم کی زبان کی توقع رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سہنا نے اس تمہید کے بعد ہی ان لوگوں کے خیالات کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے اقبال کے مخصوص "طرز انشا" (اسٹائل) کی تائید کی ہے۔ ان موید ین میں مشہور کمیونسٹ انشا۔ پرداز ڈاکٹر ملک راج آنند بھی ہیں۔ جن کا خیال ہے "اقبال کی ابتدائی کامیابی اردو کے محدود ذخیرہ الفاظ کو فارسی و پنجابی کے اثر انگریزی استعاروں اور دوسری تخیلی باتوں کے اضافے کے ذریعے سے وسیع بنانے کی کوششوں کی منت کش ہے۔" اس طرح ڈاکٹر آنند کی رائے میں اقبال نے اردو کو ایک شکل دی ہے اور اسے موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بنایا ہے۔ ڈاکٹر سہنا کو اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر آنند کی رائے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں" ۔ اقبال نے

سوچ سمجھ کر کوئی ایسی کوشش کی ہے یا اگر کوئی ایسی کوشش کی ہے تو اس میں وہ اس مزعومہ حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں جس کا ڈاکٹر آنند نے ذکر کیا ہے مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ اس لیے کہ میری نظر سے اس بارے میں کسی صاحب زبان، مستند اور غیر جانب دار نقاد کا بیان نہیں گزرا ہے بلکہ اس کے خلاف اس امر کے یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ بہت سے اہلیت رکھنے والے نقادوں کی نگاہ میں اقبال نے اچھی اردو لکھنے والے کی حیثیت سے کوئی امتیاز پیدا نہیں کیا تھا۔ پروفیسر بخاری نے تو صاف صاف لکھا ہے "اقبال پنجابی تھے۔ ان کے نقاد بالخصوص یو۔پی کے نقاد ہمیشہ ان کے طرز انشا کے نقائص یاد دلاتے رہتے تھے ان کے ان اعتراضوں میں کچھ نہ کچھ جان ہوتی تھی۔ لیکن بے رحمانہ نکتہ چینی ان میں سب سے زیادہ نمایاں رہتی تھی"۔

اس سلسلے میں اکبر علی اور ڈاکٹر نظیر احمد وغیرہ کی طرف سے اقبال کی جو تائید کی گئی ہے اس پر نظر کرنے کے بعد ڈاکٹر سہنا نے اردو اور ہندی انشاء پردازوں کے اس رجحان کا ذکر کیا ہے کہ وہ اردو اور ہندی کو گراں بار کرنے کے لیے فارسی، عربی اور سنسکرت سے علی الترتیب غیر مستعمل اجنبی الفاظ اور ترکیبیں مستعار لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں اس مماثل ادبی رجحان کا بھی ذکر کیا ہے جو سولھویں صدی میں انگلستان میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس وقت کے انگریزی ادب میں بڑے بڑے غریب و نامانوس لفظوں کا استعمال ہوتا تھا۔ بدمزہ صفتیں استعمال کی جاتی تھیں۔ غیر ضروری صنعتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ جغرافیائی سلیحات اور بڑے بڑے بھاری بھرکم مرکبات اشعار و عبارات میں نظر آتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت کا ادب سراپا تصنع ہوتا تھا۔ یہ تصنع کا رنگ بہت دنوں تک ہاتھ پیر مارنے کے بعد انگریزی ادب سے غائب ہو گیا۔ اس کا اثر ڈاکٹر جانسن اور دوسرے آٹھارھویں صدی کے مصنفین میں دیکھا جاسکتا ہے، ان کی تحریروں کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ بہت زیادہ لاطینی کی آمیزش ان میں ہوتی تھی، سروالٹر اسکاٹ نے اپنے مشہور ناول دی مونسٹری کے ایک مشہور کردار سرپرسی شیفٹس کی شکل میں اس پر تصنع رنگ انشا کا بری طرح خاکہ اڑایا ہے۔ سروالٹر اسکاٹ کے بعد جو مصنفین پیدا ہوئے ان کی

خوش ذوقی کی وجہ سے انگریزی ادب انیسویں صدی میں اس بدمزہ تصنع سے پاک ہوا ہندوستان میں البتہ یہ تصنع ادب کے مختلف روپوں میں موجود ہے، اور یہاں تو اردو میں اور نہ ہندی میں کوئی ایسا مصنف پیدا ہوا جو ہمت و جراءت سے کام لے کر اس پرانے رواج کو توڑ دیتا۔ اقبال اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان سے یہ توقع قائم کی جاسکتی تھی کہ وہ اس رواج کے بندھن توڑ دیں گے، لیکن انھوں نے بھی ایسا نہیں کیا بلکہ ان کے انداز انشانے تو اس رسم کو اور مضبوطی سے قائم کر دیا۔ زبان کی سادگی پر زور دینے کے بعد ڈاکٹر سہنا نے علامہ اقبال کی اس اردو کا جو فارسی اور عربی الفاظ سے بھری ہوئی ہے اور جس میں موٹے موٹے لفظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں جائزہ لیا ہے اور اپنے اس خیال کی تائید میں کہ ان الفاظ کے استعمال سے اردو کی روانی اور فصاحت کو شدید صدمہ پہنچتا ہے اقبال کے اردو کلام سے کچھ مثالیں پیش کی ہیں۔

حورو فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل میرے تخیلات میں
جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں حضرت آرزو مرحوم کی سریلی بانسری کے انداز نگارش کا ستائشی لہجے میں ذکر کیا ہے اور اسے بطور نصب العین کے پیش کیا ہے

جہاں تک سریلی بانسری کا تعلق ہے اس میں حضرت آرزو نے لزوم مالا یلزم کی حیثیت سے ایک خاص صنعت کا التزام کیا ہے۔ سریلی بانسری میں جتنے منظومات درج کئے گئے ہیں وہ فارسی اور عربی کے لفظوں سے یکسر پاک ہیں۔ لیکن یہیں اسے بھی صاف صاف کیوں نہ کہوں کہ اس طرز تحریر کی اہمیت بھی ایک صنعت سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو زبان جن فطری وسعتوں کی طرف پھیلنا چاہتی ہے اس میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ کوئی زبان ہو مختلف انقلابات کا سینہ چیرتے ہوئے مختلف حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا ایک مخصوص مزاج پیدا کر لیتی ہے۔

اس کے مخصوص سانچے بن جاتے ہیں۔ اردو بھی اس خصوص میں کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتی۔ مختلف حالات و انقلابات کے راستوں سے گزرتے ہوئے اس کا بھی ایک مخصوص مزاج بن گیا ہے۔ اسے بھی لفظوں اور ترکیبوں کے ڈھلاؤ کے لیے مخصوص سانچے مل گئے ہیں۔ اردو کے اس مزاج کو فارسی، عربی سنسکرت وغیرہ کسی زبان کے لفظوں سے کوئی عناد نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کے مخصوص سانچوں میں ڈھل سکیں۔ اردو کا مزاج دیکھتے ہوئے حضرت آرزو کی سریلی بانسری کا طرز انشا بڑی حد تک غیر فطری ہے اور اس لیے ڈاکٹر سہنا کی اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ فارسی اور عربی فقرے کے جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ اردو کی فصیح زبان کو صدمہ پہنچانے والے نہ ہوں۔ تخلیات خلوت کے معنیٰ میں اور زجاج شیشے کے معنی میں اقبال نے جس مقام پر استعمال کیے ہیں وہ یقیناً اردو کے مزاج کے خلاف ہیں اور اس لیے غیر فصیح ہیں۔ اقبال کی اردو شاعری میں اس قسم کے غیر فصیح الفاظ کے استعمال کی کثرت ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی اردو شاعری میں فصیح و مترنم الفاظ کے استعمال کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے۔ آپ اقبال کی کوئی بڑی نظم بعد والے دور کی اٹھالیجئے اور ان کی شخصیت کی بلندی اور ان کے لہجے کے فلسفیانہ طمطراق اور مذہبی شان و شکوہ سے قطع نظر کرتے ہوئے اس پر نظر کیجئے تو آپ کو جگہ جگہ اس قسم کے غیر فصیح لفظ ملیں گے۔ اقبال کی یہ لغزشیں شاعری کے نقطۂ نظر سے یقیناً قابل اعتراض ہیں اور یہ کہہ کر کہ اقبال کا اصلی مقصد فلسفہ طرازی یا پیغامبری ہے۔ اقبال، شاعری اقبال کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جاسکتا۔

اقبال کی ایک مشہور نظم ہے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اس میں شک نہیں کہ یہ نظم اپنے خیالات کے لحاظ سے خاص معرکہ آرا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا بھی ناگزیر ہے کہ اس نظم میں نہ صرف بعض الفاظ کا استعمال قابل نظر ہے بلکہ بعض مقامات پر بیان کا نقص بھی نمایاں ہے۔ اس نظم میں ایک شعر ہے

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میرو سلطان پر نہیں ہے منحصر

خود نگر، خطر، نظر وغیرہ کے قافیہ میں منحصر بفتح الصاد کا استعمال صحیح نہیں ہے

لغت و استعمال دونوں کے لحاظ سے صحیح لفظ مخصر بکسر الصاد ہے۔ اس نظم میں دوسرا شعر ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

چنگیز غالباً سیاہ فام تو نہ تھا۔ اس لیے اقبال کا مدعا چنگیز کے دل سے تشبیہہ دینا ہے مگر وہ اسے صاف صاف ادا نہ کر سکے۔ اس عجز بیان کا بہت ہی واضح نمونہ ان کی ایک مشہور نظم کے مندرجہ ذیل شعر میں ملتا ہے۔

حق را بسجودے و صنم را بطوفے
اچھا ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

مطلب تو سمجھ میں آ ہی جاتا ہے لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں مصرعوں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں ربط دے سکے۔ شاعری کی اصطلاح میں اس شعر کے دونوں مصرعے "لخت" ہیں۔ اقبال کے پیش نظر کسی استاد شاعر کا یہ شعر

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فرپہند
حق را بسجودے و نبی را بدوردے

اپنا مندرجہ بالا شعر "حق را بسجودے و صنم را بطوافے" نظم کرتے وقت رہا ہے اور جس طرح اس شعر کا مطلب مکمل طور سے ادا ہو گیا ہے، انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کے مندرجہ بالا شعر کا مطلب بھی ادا ہو گیا ہے حالانکہ صورت حال یہ نہ تھی۔

جس نظم کا ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اسی میں پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اے ترے سوز نفس سے کار عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار

اس مقام پر لفظ "پردگی" پردہ کرنے والے کے معنی میں اردو کے لیے بالکل ہی غیر مانوس اور اجنبی ہے اور اس لیے غیر فصیح۔ ضرب کلیم اور بال جبریل میں تو اس قسم کی مثالیں کثیر تعداد میں مل سکتی ہیں۔

ایک نظم کا عنوان ہے "جہاد" اس میں یہ شعر ملتا ہے۔

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

"فال و فر" صاف طور پر اردو کے ٹکسال سے باہر کا سکہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسری نظم ہے "امامت" اس میں یہ شعر موجود ہے۔

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

استعمال میں "سان پر چڑھانا" ہے "سان چڑھانا" نہیں ہے، ایک اور جگہ اقبال نے نظم کیا ہے۔

اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

"شیران غاب" اردو کے لیے قطعاً غیر فصیح ہے۔ اگر اقبال نے "غاب" کی جگہ "بیشہ" فرمادیا ہوتا تو یہ ترکیب اردو زبان کے مزاج کے موافق رہتی۔ اقبال کو لفظ "غمیں" سے بھی بہت زیادہ محبت ہے، اکثر جگہ انہوں نے اسے استعمال کیا ہے۔ غمیں فارسی میں فصیح سہی، لیکن اردو کے لیے قطعاً غیر مانوس ہے اس لیے ان کی اردو نظموں میں "ولیکن" لیکن کی جگہ اور "تا" "تا کہ" کی جگہ خاصی تعداد میں ملتا ہے۔ اقبال کتنے ہی بلند مقام فلسفی سہی، کتنے ہی حقیقت شناس پیامبر سہی، تاہم جب وہ شاعری کے میدان میں آئیں گے تو انہیں ایک شاعر کی حیثیت سے جانچا جائے گا، پرکھا بھی جائے گا اور ظاہر ہے کہ شاعر کے لیے زبان و بیان پوری اہمیت رکھتے ہیں۔ اسے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ جوہی چمبیلی اور گلاب کے پھولوں کے ساتھ گیندے کے پھول ایک ہی حیثیت سے پیش کرے۔ یہ امر حیرت خیز ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے اپنے رسالے "اقبال" میں اقبال کی شاعری کا ایک غالب عنصر ان کی انفرادی موسیقیت کو بھی قرار دیا ہے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمواری اور بلاغت ہے اور اس خصوص میں اقبال کو انہوں نے اردو کے جملہ شعرا پر فوقیت دی ہے۔ اس سلسلے میں جناب مجنوں نے کئی صفحے لکھ دئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ایک صاحب جذب کے کلمات عالیہ ہی کی حیثیت

رکھتا ہے ۔ جب کلام کا خاصہ حصہ فصاحت سے عاری ہے تو پھر اس میں کیسی موسیقیت، کیسا ترنم، کیسی بلاغت۔ کاش کہ جناب مجنوں نے اس جگہ جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے فارسی کلام سے مخصوص کر دیتے۔

کرشن چندر

شاعر مشرق علامہ اقبال

اقبال دور جدید کا شاعر ہے۔ ایشیا کی حیات ثانی اور بیداری کے زمانے کا۔ اس نے مغربی فلسفے کی مادہ پرستانہ تنگ نظری کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا جب کہ بادی النظر میں مغرب ہر حیثیت سے مشرق پر قابض ہو چکا تھا اور عوام ایک ایسے وقت کے منتظر تھے جب کہ مشرقی تہذیب مجموعی حیثیت سے مغربیت کے طوفان میں فنا ہو جانے والی تھی۔ اس نازک موقعہ پر اقبال نے اپنا سب سے پہلا نعرہ جنگ بلند کیا:۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

یہ آواز مشرق کے سرگوشیاں کرتی ہوئی ایوانوں میں سے گونجتی ہوئی نکلی اور ایک عالم کو حیرت زدہ کر گئی۔ مغرب نے کبھی اقبال کو کما حقہ نہیں سراہا باوجودیکہ چند ایک انجمنیں اقبال کے نام سے لندن، آکسفورڈ، برلن اور پیرس میں موجود ہیں۔ مغرب کبھی اقبال کا ہمنوا نہیں ہو سکتا۔ ابھی وہ اقبال کے غلغلہ انداز پیغام کو سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ممکن ہے آج سے کچھ عرصہ بعد جب کہ مغربی تہذیب اچھی طرح کچلی اور روندی جا چکے گی تو مغرب اقبال کے پیغام پر کان دھرنے پر زیادہ آمادگی ظاہر کرے۔

بغاوت کی یہ روح پہلے پہل اقبال کی قومی نظموں میں ظاہر ہوئی۔ اقبال انتہا درجے کا قوم پرست تھا اور اس کی قومی نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔ اس کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" نہایت مقبول ہوا۔ اس نظم کا حسن ادا اور اس کی زبان کی پاکیزگی اس قدر بے مثال ہے کہ کوئی ہندوستانی قومی نظم سوائے

"بندے ماترم" کے اس کی ہم پایہ نہیں ہے۔

دنیائے اسلام کا شاعر

اقبال جس بے تکلفی اور خوبصورتی سے اردو میں شعر کہتا تھا فارسی میں بھی اسے ویسا ہی کمال حاصل تھا۔ عقاید قرآنی کی تفہیم میں اسے قدرت سے ایک خاص ملکہ ودیعت ہوا تھا جن کے معانی کی تفسیر وہ اپنے فارسی اشعار کے ذریعے سے کرتا تھا۔ نظم اس کے اپنے نظریات کی آمیزش سے بجائے پھیکی پڑنے کے اور زیادہ مجلا ہو جاتی تھی۔ اس کے بیان میں احساس دِرد اور خلوص کی فراوانی ہے اور مدتوں تک اسے دنیائے اسلام کے ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا جس نے اپنی پر زور مجاہدانہ رجائیت کی تعلیم سے مسلمانوں کے سامنے قرون اولیٰ کا سا جوش لمان پیش کر دیا۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

پیام مشرق اور زبور عجم فارسی نظم میں اقبال کے دو عظیم الشان کارنامے ہیں پیام مشرق میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ شاعر نے ایک مشرقی فلاسفر کی حیثیت سے زندگی کے موضوع پر اپنے نظریات کے اظہار کی کوشش کی ہے۔ پیام مشرق اقبال کے مجاہدانہ فلسفے کا جنگی ترم ہے اور نیٹشے کا مسکت جواب۔ پیام مشرق کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی ہو چکا ہے۔

اقبال کے اشعار میں خودی کو بہت بلند مرتبہ دیا گیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق انسان صرف ایک معاشرتی ہستی نہیں ہے بلکہ ایک اشرف و اعلیٰ ہستی ہے۔ اس کی طاقت و قدرت نہ صرف فرشتوں پر فوقیت رکھتی ہے بلکہ کون و مکان کی اس بے پایانی سے گزر کر اور آگے نکل جاتی ہے۔

میری نگاہ سے خلل تری تجلیات میں
میں ہی تو ایک راز تھا سینہۂ کائنات میں

اقبال نے ہمیں عزت نفس اور اعتماد علی النفس کا سبق دیا ہے۔ عزت اور اعتماد نفس اور ذات کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں، صرف قومیت نو کی چھلکتی ہوئی

جوانی کے لیے نہیں ۔ اقبال اس لیے مقبول عالم ہے کہ وہ نوع انسان کے ادنیٰ جھگڑوں سے بلند ہو کر ایک اڑتے ہوئے عقاب کی نظر سے اہل زمین کو دیکھتا ہے۔ انسان کو انسان بننے کی تلقین کرتا ہے اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے اس کا پیغام ترک نفس کے لیے نہیں ہے بلکہ ابدی و ازلی امید اور انسان کی ناقابل تسخیر طاقت کو بیدار کرنے کا پیغام ہے۔

اقبال کے اشعار میں جہاں گہرا مذہبی رنگ نظر آرہا ہے وہاں سرکشی کی ایک جھلک بھی نظر آتی ہے ۔ ممکن ہے اقبال کی یہ دو رنگی عوام کی نگاہوں کو کچھ عجیب سی نظر آئے لیکن حقیقت میں عظیم الشان شاعروں کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے ۔ یہ سیال مرکب ہمیشہ نئی سے نئی شکلوں میں ظاہر ہونے پر قادر ہوتا ہے ۔ یکسانیت اور ایک ہی روش کی پابندی کوئی قابل تعریف وصف نہیں ہے ۔ خصوصاً ایک حقیقی شاعر کے لیے ۔ اقبال دنیا کو ایک سچے شاعر اور صاحب بصیرت کی نظروں سے دیکھتا تھا وہ دنیا کے حسن ، خوبصورتی اور بے بہا مسرتوں کو صرف دیکھتا ہی نہیں تھا بلکہ محسوس بھی کرتا تھا۔ وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس کی عقابی نظر اور اس کے شاعرانہ ذہن کی دور رسی ان کروڑوں مظلوموں اور بے کسوں کے دلوں تک جا پہنچتی تھی جن کے دکھ درد کا احساس اس کے درد مند سینے میں موجود تھا۔ اس کا فلسفیانہ ذہن موجودات کے تجزیہ پر آمادہ ہو گیا۔ شک اس کے اشعار پر اثر انداز ہوا اور اسی کے ذریعے سے اس کی شاعری میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی اور ایک نیا نظریہ قائم ہو گیا۔ بعض اوقات اس جذبہ کا اظہار دبی زبان سے کیا گیا ہے لیکن بعض اوقات اس کے اظہار میں بلند آہنگی پیدا ہو گئی ہے ۔ اقبال کی یہ خصوصیات شیلے سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہیں ۔ شیلے کی طرح اقبال بھی ایک بہت بڑا باغی ہے ۔ غالباً فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال شیلے سے زیادہ مدبر اور پختہ کار باغی ہے ۔

اقبال سرمایہ داری کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن سوشلسٹوں کے برعکس اس کی نفرت مادی مخالفتوں پر محمول نہیں تھی بلکہ عمیق روحانی تاثرات لیے ہوئے تھی ۔ چنانچہ بانگ درا اور بال جبریل میں وہ غضب آلود انداز میں سرمایہ پرستی کے نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی ناکامی اور آخرکار تباہی کی پیشین گوئی

کرتا ہے۔ "ساقی نامے" میں کہا ہے۔

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

"لینن خدا کے حضور میں" کے عنوان کے ماتحت اقبال غصے کے انداز میں خدائے تعالیٰ سے سوال کرتا ہے کہ نوع انسان کے معصوم ترین طبقے پر یعنی غربا کے گروہ پر یہ دردناک عذاب کیوں روا رکھے جاتے ہیں اور ایسے جیسے خود ہی اپنے شکوک و شبہات کا جواب دے رہا ہو وہ "فرمان خدا" میں لوگوں کو اس برے نظام کو کلیتہ فنا کر دینے کی تلقین کرتا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے ملتی نہیں دہقان کو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
حائل رہیں کیوں خالق و مخلوق میں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

لگی لپٹی رکھے بغیر، طوفان انگیز جوش کے ساتھ جس طرح اس نظم میں مظلوموں کی حمایت کی گئی ہے اس کی مثال ساری کی ساری مشرقی شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ مشرقی نغمے میں یہ ایک بالکل نئی تان ہے۔ ایشیا کا "لامارسیلز"

اقبال نے بہت سی غزلیں بھی کہی ہیں۔ یہ غزلیں اردو شاعری کی بہترین روایات کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ غزلوں کے معاملے میں اقبال پر بھی دوسرے بلند پایہ شعرا کی طرح مرزا غالب کا رنگ غالب تھا۔ لیکن اقبال کی غزلیات میں اس کی رجائیت اور مجاہدانہ نقطہ نگاہ کی وجہ سے وہ پژمردگی اور حزنیہ تغزل نظر نہیں آتا جو عام شعرا کا شیوہ ہے۔

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق

شاخ گل میں جس طرح باد صبحگاہی کا نم
عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیرو بم
جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

اقبال کی موت مادر وطن کے ایک ممتاز ترین فرزند کی موت ہے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام ایشیا اس کی موت پر ماتم کر رہا ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں اس کی قابلیت مسلمہ ہو چکی تھی اور اس کی شہرت دور و نزدیک پھیل چکی تھی۔ ہندوستان اپنے اس قابل فرزند پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اقبال کا پیغام ان الفاظ میں نہیں ہے جو اس نے بحیثیت ایک سیاستدان کے کہے بلکہ اس کا حقیقی پیغام اس کے اشعار میں ہے جہاں وہ آیندہ نسلوں کے لیے روشنی کے مینار کی طرح اپنا نور چاروں طرف بکھیر رہا ہے۔

ٹیگور اور پریم چند کی طرح اقبال بھی دور جدید کے تمدنی رخ کے حسن کو تمام و کمال ظاہر کر دیتا ہے۔ اس کے جذبات و خیالات اتنے بلند پرواز ہیں کہ وہ ذات پات، فرقوں اور نسلوں کی حدود سے گزر جاتا ہے اور شوق آزادی میں اسے اس ذات بے پایاں سے بھی شکوہ رہ جاتا ہے۔

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی

continues, added to His creation.

Man, or finite personality [illegible] distinguishable by the [illegible] an aspect of God [illegible] has become self-conscious [illegible] finite [illegible] endowed with the capability of becoming [illegible] process of dynamic [illegible] ascendance [illegible]

[illegible] be accomplished [illegible] love [illegible] indifference [illegible] Who is [illegible] Man [illegible] from the Ultimate [illegible] new situations and efforts [illegible] opportunities of creative unfolding.

Man and Cosmos distinct from each other and yet together the example of the [illegible] into the Ocean [illegible] applies to [illegible] to [illegible] themselves and cannot stand the shock of [illegible] But those personalities which [illegible] themselves [illegible] being like pearls in the perpetual flow of the Divine Sea. Their [illegible] and [illegible] but they are held in the All-Embracing Ultimate Ego within itself and [illegible] return their separate and distinct existence in the presence of the overpowering light of the sun.

continues adding to His creation.

Man, no doubt possesses his own individuality and, therefore is distinguishable fro the Universe and in the process of creation he, as an act of God, has become selfconscious. As a finite ego, he is the vicegerent of God on earth. He is undeniably a creative being and is endowed with the capability of becoming a co-worker with God in the process of dynamic change and ascendancy with his initiative and creative thinking.

Immortality cannot be gained by man as a matter of right. It is to be accomplished by him through the fortification of his ego or personality by love, *Faqr* (indifference to mundane rewards), Courage Tolerance, *Kash-i-Halal* (lawful earning) and participation in purposive and creative activities. Who is not aware that the man always marches on ward to receive ever fresh illumination from the Ultimate Ego. Each and every act of man brings a new situation and affords wider and extensive opportunities of creative unfolding.

Man and God are distinct from each other and yet together. The example of the submergence of the drops into the Ocean only applies to those egos which fail to fortify themselves and cannot stand the shock of death. But those personalities which fortify themselves, live, move and have their being like pearls in the perpetual flow of the Divine Sea. Their existence is not obliterated and effaced but they are held by the All-Embracing Ultimate Ego within itself just as the flames of the candles retain their separate and distinct existence in the presence of the overpowering light of the sun.

finding a solution of the intricate problems of the Ummat-i-Muslima. He was inspired to move on the right direction and as he tread on that path his poetry received a new turn and became more virile and vigorous. This brings us to his period of Discovery. which commences from 1912.

This period broadened his vision and his poetry attained a prophetic character. His vehicle of expression now sought new frames in order to embrace a wider circle including not only the Muslim world but humanity at large. His major works during this period are in Persian. He employed the forms and imageries mostly from Islamic literary tradition to stimulate the *Ummat-i-Muslima* to an absolutely new vision and insight. the poetic diction of this period is replete with clarity. lucidity. simplicity and profundity of thought and emotions.

Iqbal's works belonging to the Period of Discovery began with the publication of "*Asrar-i-Khudi* (The Secrets of Self) in 1915 and "*Rumuz-i-Bekhudi*" (the Mysteries of Selflessness) in 1918. These Mathnawis heralded the era of Iqbal's role as a great philosopher and sage who crusaded against the decadent philosophy of Pantheism and propounded his own views on the individual and social growth of the Millat in the light of the Quran With the appearance of "*Payam-i-Mashriq*" (The Message of the East) in 1923 in reply to Goethe's "West Ostlicher Divan" he widened his message and Philosophy of Ego to reawaken the Muslims from their slumber and inert state.

In 1927. "*Zabur-i-Ajam*" (The Persian Psalms) saw the light of day With the publication of his thought provoking lectures. "The Reconstruction of Religious Thought in Islam". he animated the spirit of the Muslims and spurred them towards creative thinking and purposive activity to march onward for the revival and renaissance of the Muslim world. He felt that Islam was dynamic and revolutionary movement. but centuries of stagnation had laid some layers of dust over its thought. The Muslims had to be reawakened to play their rightful role in the fashioning of the future. There is no denying that these lectures had a tremendous influence on the minds of the Muslims

The message of Iqbal is based on religio-philosophical ideas with considerable coherence and consistency. He believes that the existence of God cannot be established by Intellect but by Love (Ishq). God is the ultimate Ego whose infinity is intensive. He is perennially creative and

the Quran and Sunnah. An intensive study of Islamic culture and civilisation brought home to him the realisation that Pantheism and non-Islamic Sufism had sapped the foundations of Islamic socio-economic edifice and had caused the decline of their ascendancy. The pantheistic attitude created a passive mentality and retarded the spirit of creative thinking and virile and dynamic way of living. Iqbal shook off such shibboleths and started afresh with the pristine Islamic spirit of the Quran which made the Muslims what they were at their best.

Iqbal advised the Muslims to revise their attitude towards the West. and instead of following it blindly they should use reason and vision. The only course open to them was to approach modern knowledge with a respectful but independent attitude. How rightly he says in "*Pas Che Bayad Kurd Aiy Aqwam-i-Sharaq*".

"Humanity is in agony at the hands of Europe and life has lost its joyful tumult: What . then. is to be done . to peoples of the East that the lost glories of the Orient be regained? A revolution has taken place in the depths of her being. The night is passed and the sun has risen. Europe lies smitten by its own sowrd: And has given irreligion to the world: A wolf in lamb's skin. Ever in ambush for the lamb. It has brought trouble to humanity and life. but a random caravan without a destination."

Iqbal has beautifully expressed the view that religion alone could extricate mankind out of the prevalent social chaos and intellectual confusion. The Danish philosopher and theologian Soren Aabye Kierkegaared (1813-1855). and Tomas Stearns Elito (1888-1965). Nobel laureate. critic and essayist. condemned the secular-captialist-democratic order that gave birth to an irresponsible. unscrupulous and undisciplined crowd which refused to listen to those isolated few who believed that truth was subjectiveity and that the individual before God was the only final reality. They foretold that the development of materialistic and atheistic trends in Europe would result in the establishment of authoritarianism - Fascism and communism. Eliot's superb poems. "The Hollow Men". "The Waste Land" and "Four Quarters" envisage a compelling vision of the spirtual emptiness and desolation of the West.

After his return from Europe. Iqbal became aware that the spirit of dynamic Islam was the only destiny. this led him to compose him poem *Du'a* (Prayer) in 1912. imploring God to show the path of guidance for

Iqbal's view of Islam.

By Prof. Ziauddin Ahmad.

Iqbal is one of the most outstanding seers of the century. He has exercised considerable influence on the trends of modern thinking and has reawakened the dormant spirit of mankind so that it may move forward into creative activity and dynamism.

He believes that poetry cannot long remain separated from religious consciousness if it is to achieve a higher level of expression. Religion is a power as ancient as the world. and if philosophy - the parent of the sciences- has been universally acknowledged as the child of religion, there is no reason why poetry. which in its higher form. is more philosophical than philosophy itself should not be considered the child of religion.

The conflict between the experience of men and the religious aspirations of the age has spurred the poetic geniuses of the world to produce the most remarkable poems like ''Iliad''. ''Divine Comedy''. ''Paradise Lost''. ''Mathnavi'' of Rumai and ''Faust''. In the galaxy of English literature poets like Edmund Spencer. Mllton. Langland. Coleridge. Wordsworth, Browning and tennyson shine most brilliantly as exponents of religious emotions.

Jamaluddin Afghani. among others. influenced. to a large extent. Iqbal's vision of Islamic solidarity. It is. therefore. imperative to study the development of his mind and thought by demarcating his life into two periods - the Period of Seeking and the Period of Discovery.

The Period of seeking may be reckoned from 1895 to 1912. during which time he composed his poems on diverse topics. He was attracted by nature and wrote on mutually ill-adjusted states. dominated by self-interest and narrow nationalism. But Islam never compromised with such ideals. It rather demolished this doctrine altogether.

Being fully disillusioned by the western culutre. Iqbal focused his attention on religio-cultural tradition of Islam and drew inspiration from

culmination of spiritual progress. is according to Iqbal. un-Islamic like idea of Nirvana. Iqbal accepts mystical experience as the basis of the religious consciousness. but it has to be the right type of mysticism.

Iqbal's idea of Personality is not entirely new one: indeed. it is derived. like the rest of his philosophy. from the *Quran*. and is exemplified. in supreme degree in the life of Muhammad. Rumi. Al-Jili and others had glimpses of the same idea. Iqbal's presentation is . however a new one in that it is set against the background of modern developments in the sphere of science. philosophy and culture. and seeks to plant the Islamic conception of human possibilities firmly in the fertile soil of modern thought.

Iqbal was a firm upholder of what he called the principle of movement in the structure of Islam. what Muslim jurisconsults refer to as *'Ijtihad'*. He felt that Muslim law and jurisprudence needed to be reviewed in the light of modern problems. and intended writing a book on the subject himself.

These are some of the main contributions of Iqbal as an exponent of Islamic thought. His approach is positive. synthetic creative. He has given to Muslims what they lacked before. namely. their self-respect. He brings to humanity what seems to have lost in our time. namely faith in its own greatness and the greatness of its future. For him. Islam is a dynamic movement with infinite aspirations and possibilities of achievement. And. by presenting a clear view of Islamic ideology to the world at large. he has promoted friendhsip and understanding between nations and races in the East and the West in the deepest meaning of the wor d

Europe since the Renaissance and the Reformation is un-Islamic. Modern European nationalism is a kind of religion which is in direct conflict with the broad humanism of Islam which does not recognize any barriers of race. nation or geography. It is only in this Islamic humanism that Iqbal sees a future for humanity.

Along with the scientific spirit. Iqbal has emphasized the study of history as an essential componenet of the Islamic attitude towards life and the Universe. He points out that the *Quran* repeatedly appeals to History and nature. He brings out the important fact that the spirit of the *Quran* is anti-Classical and that the intellectual movement of Islam. instead of being a shadow of Greek culture. as is often supposed. was a movement in direct conflict with the Greek attitude. Greek thought was concentrated on man and his problems. and largely ignored the phenomena of nature. The *Quran*. on the other hand. exhorts Muslims to look for knowledge in the physical world outside as well as in the world of inner experience. Those schools of thought and belief. which shut themselves away from the world of physical events. are. therefore. essentially un-Islamic in character.

Iqbal emphasises the relationship between reason and Revelation and points out the rationalistic foundations of Islamic belief. According to him. there are no dogmas in Islam. nothing that need be believed in spite of its being unreasonable. or because of its being so.

The greatest contribution of Iqbal. as an exponent of Islamic thought. is in regard to his so-called Doctrine of "*Khudi*" or "*Self*". which embodies his idea of human personality. For him. the personality is the measure of all intellectual, moral and aesthetic achievement. That which strengthens Personality is goods. that which weakens it is bad. God is the most unique. the most creative and the most progressive Personality and man must follow God and cultivate His attributes. if he is to fulfill the purpose of his own existence. Ceaseless creative activity undertaken in the service of an ideal and the highest ideal is the creation of an Islamic State of Society in the world is the key to all self-fulfilment. This is the only claim that man has for life and death.

Iqbal's doctrine of Personality with its insistence on active creative effort leads to a rejection of all quietism. whether expressed through philosophical systems or mystical experience. The mystical *Fana Fillah* or annihilation in God. which is regarded by a number of *Sufi* sects as the

together. He gave them European education and tried to effect rapprochement between them and their British rulers. This saved the community from extinction and gave it a future. Syed Ahmad Khan gave a personal lead to his fellow Muslims in the field of historical research, and he spoke for moral and religious reform. His educational and intellectual activities, however, did not find unanimous acceptance among Muslims and a cleavage developed between men of the "New Light", as they were called, who followed Syed Ahmad Khan, and those of the "Old Light" who wanted to cling to the past. It appeared at that time that one had either to be with Syed Ahmad Khan or against him; there was hardly a middle way.

It was at this stage that Iqbal appeared on the scene. His task lay not so much in reconciling the new light and the old as in achieving a new and higher synthesis of both in a new presentation of Islam in the light of modern philosophical concepts. These concepts were somewhat unfamiliar to his fellow Muslims, who had lost touch with the world of events and in whom the spirit of enquiry had withered away in the midst of theological controversy and legalistic casuistry. Before Iqbal, Jamal-Uddin Afghani had recognized the importance of modern science and the need for an intellectual regeneration of Muslims to enable them to recapture their own scientific tradition and win a place of honour for themselves in the field of scientific achievement. But Iqbal went further. He rediscovered the philosophical foundations of Islamic thought and Islamic culture, and subjected the systems of Eastern and Western thought to critical scrutiny in the light of his discovery. In the modern jungle of social and intellectual "isms" he showed exactly where Islam stood. His criticism of Western civilization is matched by his searching analysis of Eastern civilization and of the un-Islamic elements which have grown like fungi over the ideology of Islam. He is the first and, indeed, the only Muslim in modern times who has faced Western thought and culture fairly and squarely, recognized the vital and progressive elements in it, and rejected the rest. More than that, he has shown that the spirit of enquiry and adventure which has informed the intellectual endeavours of the West in modern times is essentially Islamic in origin, and that the Muslims instead of fearing it and keeping sullenly away from it, have to make it their own once again. And by doing so, he has given the Muslim mind a sense of balance which it lacked before, and has also served to bring East and West together in a way which would not have been possible on nay other basis.

For Iqbal, the modern concept of nationalism that has developed in

Iqbal

by

Mumtaz Hasan

The history of Islam is the history of an ideal struggling towards fulfilment. It stood out as a movement for human freedom. seeking to emancipate men from fear and superstition. and tyranny and bondage. It set itself against kingship and priesthood: it rejected all ritual and all dogma. Yet. after the initial phase. a phase unparalled in the history of the human race. Islam found itself face to face with rise within its own domain. of those very institutions it had sought to destroy. Priests and Kings grew up. And then there were mystics. who posed a new problem. Early mysticism in Islam was nothing but a name for a life of selfless and devotional purity. but about the turn of the first century after the Hejira. the Muslim mystics began to encroach on the Ideologial field and put forward philosophies of their own. Many of these philosophies were non-islamic in their inspiration and ideological direction. Islam had thus to contend with un-Islamic influences most of the time. There were men who kept the original spirit of the movement alive. who stood for the preservation of Islamic values. and spent their lives in the service of the cause they held dear. Muhammad Iqbal was such a man.

In the Indo-Pakistan Sub-Continent. the Arab occupation of Sind and the surrounding territories came to an end in less than two centuries and the northern invaders who came later did not have the same understanding of the spirit of Islam as the Arabs. It was a story of action and reaction. The pendulum swung from the orthodoxy of men like Sikander Lodi to the opposite extreme under the Moghal Emperor Akbar. and swung back again to the austeritics of Aurangzeb. The spiritual revolt against Akbar started with Shaikh Ahmad of Sirhind in the 17th century and the movement for a restoration of Islamic vlaues in their original purity. and culminated in the *jehad* of Syed Ahmad of Breilly and Shah Ismail of Delhi. With the final annihilation of the Mughal Empire in 1857. the Muslims of the Indo-Pakistan had completely lost their political and economic position. and the educational system on which their culture and civilization were founded had been destroyed. Syed Ahmad Khan rallied them

flowering of his poetic genius. The Rose of Lahore, henceforth, was to remind the world, of the Roses of Shiraz and Nishapur, the geniuses of Saadi, Hafiz and Omar Khayyam.

The concluding Persian verse of the poem clearly alludes to the two parallel meetings of great minds and souls. Maulana Rumi's meeting Shams Tabrez and Allama Iqbal's meeting Atiya Begum. The outcome was nearly the same. Shams Tabrez became the fountain-head of all inspiration to Maulana Rumi. What was Shams Tabrez to Maulana Rumi, Atiya Begum was to Allama Iqbal – a perennial source of immortal poetry.

The poem is a land mark in the poetic career of Allama Iqbal. It marks an important phase in his life, as recorded by a close companion of Allama Iqbal, Shaikh Abdul Qadir, Bar-at-Law, editor of the literary magazine "Makhzan" (مخزن)

While in Europe, Iqbal experienced a strange emotional crisis – a sudden turn of mind. As a result, he seriously contemplated giving up writing poetry. But by timely intervention of his friends and well-wishers, expecially Sir Thomas Arnold, whom Iqbal greatly adored and held in high esteem, Shaik Abdul Qadir and Atiya Begum, whom Iqbal had just met in London and by whom he was greatly impressed, Iqbal was disuaded from divorcing poetry. Dr. Iqbal came out of this stupor successfully and a great poet was re-born. Poetry hence forward remained a life long passion with him. Poetry was on his lips unto his last!

Thank God, a great poet was not lost to the humanity. As it did happen in the case of a French poet Arther Rimband. "After publishing his book of poems "Une Saison ess Enfer" Rimbared apparently came to an impasse, burnt his manuscripts and left Europe to become an ivory trader and gun runner in Abbyssinia." [1] and the poet was lost.

Iqbal has every reason to rejoice and celebrate over what he regained. The poem, as such, proclaims re-incarnation of the poet. It is a celebration of the soul and it rejoicing and revelling, that exceeds celestial joy and innocent delight. It captures the initiation of re-

---

1. *Literary Criticism: A short History, by William K. Whimsatt., JR. & Cleanth Brooks. (Oxford & IBH Publishing Co.,) - Indian Edition 1964.*

Fire of love has flared up Blisters on my
heart into flames
My songs now have under currents of
lightening and thunder-bolts

Rouge of love has polished and turned this
dusky dust into a Mirror
Mirror that reflects presence of a companion
of long years' friendship

When entered into prison (of love), I exactly
experienced the taste of freedom
When lost, the heart exactly regained life's luster
and grandeur

Star of my fortune shines on borrowed light
from that Sun,
The dust of whose path puts even Moonlight
to shame.

Just at a first sight, you taught to me
the mystic lesson of self annihilation
On what a cold day, straws of my vase-self
caught fire from you and got totally burnt out

Oh! Nightingale, the rose, which I
pined for
By a chance of good fortune, the same has
come my way, at long last!

Tossing in anguish myself, I made others toss
I used to be put to shame, whenever I found you
pouring forth delightful numbers!

Not the heart, but rolling mercury was
in my bossom instead
How it longed eagerly, for a sinning
in love's innocent sins!

My miserable despair was well-known
among my fellow-beings
My morning mirrored the dark night

Breathing in was like a lancet
piercing through my wounded bossom!
Underneath the calm of my silence
hidden there was tumult and commotion
of the doom's day
And Lo! Now in the world of emotions
no disturbance ever occurs
And my musings no longer felt
harsh and course by the audience

The poem is important in so far as it reveals an important trait of Iqbal's character. Iqbal had a habit of passing witty and extempore remarks at parties, get-together or when they used to go on study excursions. 'Atiya Begum has recorded some of his wity remarks on such occasions. Iqbal's humorous poems are appended at the end, in his first Urdu work Bang-i-Dira but by and large Iqbal's wit and humour side is obscured by his image of a serious mystic poet and philosopher.

There are number of poems written in Germany. One such poem is Wisal (Union) which is written in Munich especially for 'Atiya Begum. Iqbal sent his poem from Munich to 'Atiya Begum, who was in Bombay at that time. 'Atiya Begum was great well-wisher of Iqbal and his constant companion in Germany.

وصال

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبی قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھکو جب رنگین نوا پاتا تھا شرماتا تھا میں

میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا سیماب تھا
ارتکاب جرم الفت کے لئے بیتاب تھا

نامرادی محفل گل میں مری مشہور تھی
صبح میری آئینہ دار شب دیجور تھی

از نفس در سینۂ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیر خاموشی نہاں غوغای محشر داشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہل گلشن پر گراں میری غزلخوانی نہیں

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے میرے

غازہ الفت سے یہ خاک سیہ آئینہ ہے
اور آئینے میں عکس ہمدم دیرینہ ہے

قید میں آیا تو حاصل مجھکو آزادی ہوئی
دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آداب فنا آموختی
اے خنک روزی کہ خاشاک مرا واسوختی

Schopenhauer, Neitzache, Goethe, Bergson, Kant, Hegal, John Lack, Tolstoi, Karl Marx, Darwin Browning etc. All herded together to form a poetic picture gallary.

During his stay in Germany, Iqbal preserved and perpetuated an evening on the bank of river Nicher in Heidalberg, in one of his poems of the same name:

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نواغروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بیہوش ہوگئی ہے آغوش میں شب کے سوگئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے تہ قافلہ ہے درارواں ہے

"Tranquil is the moonlight/stone-still are the boughs and branches of the trees/ Singing birds of the vale and dale are mute/ The greenery covered mountains are silent/ As if the very nature had lost its consciousness or is fast asleep in the folds of the night/ Silent is the caravan of stars/ This caravan proceeds without the caravan-bell ringing/ Silent are the mountains, the plains and the rivers, as if the nature herself is lost in meditation. Oh heart! you also be quiet and go to blissful sleep, with all your worries tightly pressed to your folds.

Iqbal excells in emotive description of the landscape and country-side. We have a number of poems to that effect like ابر کہسار، ہمالہ etc. Iqbal was definitely inspired and influenced by the nineteenth century, English romantic poets, like Wordsworth, Keats, Shelly, William Blacke even Tennyson, the pioneers of emotive descriptions of the landscape and the country-side. All these poets figure in Iqbal's poetry, in the first part of the Bang-i-Dira, his first collection of Urdu poetry.

The poem ... کی گود میں بلی دیکھ کر from Bang-i-Dira has reference to the German context. Some German ladies were very fond of Iqbal. They were his great fans. Once they visited Iqbal in Lahore, alongwith a famous painter Amrita Sher Gill. One of the visiting German Ladies, carried a kitten in her laps. I am sure the cat was also German. Iqbal wrote the poem almost extempore, immediately after their visit. The poem is addressed to the pet and not to the lady

already in Germany. It was written in the German language and when it was read out both the fluency of the writer and the literary merit of the work were admired. Prof. Arnold requested me to give the letter to him, saying "Though Iqbal is my pupil, I get instruction from his writings." He further said that I was fortunate in receiving such an important communication from his and assured me that "this will remain a cherished piece of German literature in my possession."[1]

Iqbal's elegy on Ghalib a renowned Urdu/Persian poet of the nineteenth century, belongs to the early period i.e. before he proceeded to Europe for higher studies. It is considered one of the best poetic tributes paid to a great poetic genius by another equally great one. Even at this early stage, Iqbal's mind leaps to Germany. In this poem, entitled " مرزا غالب " Iqbal refers to the great poet of Germany, Goethe and Weimar, where Goethe lies buried.

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

"The very faculty of speech feels proud of your miraculous expressions. Even the Pleiads (the highest constilation of stars in heavens,) is bewildered on the soaring flight of your imagination./the beauty of theme is madly infatuated by your style/ A little unblossomed bud of a flower poses a serious taunt to the rose of Shiraz (i.e. Poet Hafiz), Ah! you (i.e. Ghalib) are eternally sleeping in the ruined city of Delhi (i.e. devoided of geniuses) when your fellow-singer has chosen his eternal abode in Weimar."

When Iqbal published his poem on Ghalib, in Goethe's comparision, who would have thought that years later, he was to write a rejoinder to Goethe's "Diwan of the West" Iqbal wrote his پیام مشرق in reply to Goethe's "Diwan" Critics have all agreed that of all his Persian works published before پیام مشرق is the best poetry, more matured, more vigorous more poetic, more inspired with lyrical tinge, with flawless flow of poetry. At the same time it is more thought provoking - yes, naturally because it is inspired by none but Goethe himself. پیام مشرق is an attempt to highlight Goethe's interest in the east in general and in Persian in particular. It is in this book that Iqbal reflects in depth on European thinkers and Philosophers. In the fourth part of پیام مشرق entitled نقش فرنگ he unveils the intellectual portraits of great men of the West, like

---

1. Iqbal by 'Atiya Begum

"As fragrance emanates from the flower bed, I am proceeding away from home. A test to my endurance lies ahead on my way. Thirst for knowledge pulls me out of the beloved motherland."

Iqbal is also unique, in so far as, he was the first great poet of Urdu and persian, who came directly in live contact with modernity in Europe. Though the out come was unexpected. He reacted sharply against modernity that was extirpating rich cultural and spiritual values of life of the past. Much before Iqbal, Ghalib presages modernity, but Ghalib only stands on the frontiers of modernity and was more than happy to welcome modern age.

Iqbal followed in the wake of his master. Sir Thomas Arnold to London and after studying under him for two years in Cambridge. it was at the behest of his master that he proceeded to Germany, in June 1907. Prior to that Iqbal had read a lot about Germany and had studied German philosophy especially.

Iqbal's close companion. 'Atiya Begum, who was with Iqbal in Germany, reveals that "Iqbal was all for German knowledge and said "If you wish to increase your understanding in any branch of learning Germany should be your goal." He further declared wirtes 'Atiya Begum. "By discussing with others a new world opens and it is with this method that I acquired all that I know."[1]

Iqbal's poetry is a net-work of multi-cultural interaction Arabic. Persian, Sanskrit. French. Germany, Turkish and English. Iqbal's German encounter and interaction with German spectrum was direct and in person and not indirect or through translations. He came in live contact with German contexts in his poetry. Iqbal, 'Atiya Begum informs us, "had hardly taken three months to master the German Language, which in itself made him appear an intellectual freak in the eyes of the professors. Iqbal's mastery over German language will best be explained by an incident recorded by 'Atiya Begum.

"On the 23rd July. 1907, a conversation was held at which most of the Indians in London assembled amidst enthusiasm... when the enthusiasm subsided. I brought out a letter I had received from Iqbal. who was

---

1. Iqbal by 'Atiya Begum.

"GERMAN REFERENCES AND REFLECTIONS IN DR. IQBAL'S POETRY

Dr. Allama Iqbal, as he is popularly known, was a poet "Par excellence." There are many facets of his personality. He is described as a poet, a philosopher, a mystic, a dreamer, a social reformer and politician, etc. But he was essentially a poet. He expressed himself mainly through poetry. If he has been a philosopher, he propounded his philosophy through poetry. If a mystic, he muses tenets of his mysticism through poetry, (like great masters of mystic poetry, Attar, Sanai, Maulana Rumi). If a dreamer, he embodies his dreams in poetry. If a reformer, he used the art of poetry as an instrument to bring about social changes. And, if a politician, he responded and reacted to other politicians through poetry. He chose poetry as a main vehicle of his thought-philosophical, mystical, social, political, aesthetic. His mind and soul lay bare in poetry.

I would like to describe Dr. Iqbal as a poet of all times and of all climes "of all climes" because, his genius flowered into a world poet and his vision attained a universal out-look after he left the shores of the motherland for Europe, for higher studies. By some of his companions, among others, Atiya Begum, Iqbal is described as a unique poet of Urdu and Persian.[1] He is unique in many respects. He is the Most travelled poet, perhaps, next to the great master poet of Persian literature, Sa'adi of Shiraz (Iran) and between the two, they stand about seven and a half century apart. In the corpus of Dr. Iqbal's works, we come across poems written in different parts of the world. There are poems, which are written in France, Italy, Sicily, Spain, London, Afghanistan, Egypt, Germany, Palestine, etc. Iqbal travelled far and wide in search of knowledge. He was a seeker. He was charged with the spirit of seeking knowledge. There is a saying of the Prophet, "knowledge is the foremost thing to acquire and to get that one must go even to the other end of the world." Iqbal's deep love for the Prophet is well known. He felt personally commanded by the Prophet's saying. He was a pilgrim on the road to knowledge, seeking knowledge like the pilgrim in Bunyan's "Pilgrim's progress". It was in that spirit that Iqbal set on a journey to Europe, in 1905, in his own words:-

---

1. Iqbal by Atiya Begum : Academy of Islam Publication : 3.

CONTENTS

1	German References and Reflections in Dr. Iqbal's Poetry	Dr Ahmed A. Ansari	3
2	Iqbal	Mumtaz Hasan	12
3	Iqbal's View of Islam	Prof. Ziauddin Ahmed	16

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Hyderabad.

April 1995

★ ★ ★

IQBAL ACADEMY
Madina Mansion, Narayanguda,
Hyderabad – 500 029. (A.P.) India.
Phone : 595230.

ISBN-81-86210-